وعظ

خواصُ الخشِیّة

(خوفِ حق کے خواص وآثار)

یہ وعظ حضرت تھانویؒ نے ۲۷/ ربیع الثانی ۱۳۳۰ھ کو تھانہ بھون میں
جناب سراج الحق صاحب کے مکان پر بیان فرمایا۔

ϰ er&

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یہدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہٗ ورسولہٗ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم۔

اما بعد! فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ كَبِيْرٌ وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِاجْهَرُوْا بِهٖ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ﴾(۱)

”بے شک جو لوگ اپنے پروردگار سے بے دیکھے ڈرتے ہیں ان کے لئے مغفرت اور اجر عظیم مقرر ہے اور تم لوگ خواہ چھپا کر بات کہو یا پکار کر کہو اللہ تعالیٰ کو سب کی خبر ہے کیونکہ وہ دلوں تک کی باتوں سے خوب واقف ہیں بھلا کیا وہ نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے اور وہ باریک بین اور پورا باخبر ہے“۔

مفتاح الاعمال

یہ تین آیتیں ”سورۃ ملک“ کی ہیں حق تعالیٰ نے ان آیتوں میں ایک بہت بڑے عمل کی فضیلت بیان فرمائی ہے گویا کہ وہ عمل مفتاح الاعمال (۲) ہے اور اسی مضمون کی تاکید کے لئے کچھ مضامین بڑھائے ہیں اور وہ عمل خشیت اور خوف

---

(۱) سورۃ الملک: ۱۲۔۱۴ (۲) تمام اعمال کی کنجی ہے۔

یعنی خدا تعالیٰ سے ڈرنا ہے پس ان آیتوں میں اپنے سے ڈرنے کی فضیلت بیان فرمائی ہے یہ حاصل ہے اس مقام کا اجمالاً۔

اعمال کی اقسام

اور حقیقت اس فضیلت کی اس کے اثر میں غور کرنے سے معلوم ہو سکتی ہے اور وہ اثر ہی سبب ہوا ہے اس وقت بیان کرنے کا اور وہ اثر یہ ہے کہ یہ عمل یعنی خشیت کنجی ہے عملِ صالح (۱) کی اور وہ دو عمل ہیں طاعات کو اختیار کرنا اور معاصی (۲) کو ترک کرنا۔ اور اگر کوئی کہے کہ گناہ نہ کرنا تو کوئی عمل نہیں اس لئے کہ عمل تو کسی شئے کا کرنا ہے اور یہاں نہ کرنا ہے مثلاً ہم اس وقت بیٹھے ہیں نہ چوری کر رہے ہیں نہ شراب پی رہے ہیں، نہ کسی پر ظلم کر رہے ہیں بات یہ ہے کہ معاصی نہ ہونے کی دو صورتیں ہیں، ایک تو بلا تعلق عزم (۳) کے اس حیثیت سے تو واقعی وہ عمل نہیں بلکہ ''عدم العمل ''(۴) ہے اور دوسری صورت یہ کہ ترک کا عزم کرنا اس اعتبار سے وہ بھی ایک عمل ہے اسی واسطے اس کو '' کفُّ النفس '' (۵) سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس پر اجر (۶) بھی ہے۔

خلاصہ یہ کہ عمل کی دو قسمیں ہیں طاعات کا اختیار کرنا اور معاصی سے اپنے نفس کو روکنا، خشیت ان دونوں کی مفتاح ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ طاعت نہ کرنا اور گناہ کرنا اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اس وقت خوفِ خداوندی غالب نہیں ہوتا۔ غلبۂ خوف کے ہوتے ہوئے کوئی وجہ نہیں کہ آدمی کسی طاعت کو چھوڑ دے یا کوئی گناہ کرے۔

---

(۱) خوف خدا نیک اعمال کرنے کی چابی ہے (۲) نیکیوں کو اختیار کرنا برائیوں کو چھوڑنا (۳) ارادے کے بغیر (۶) عمل نہ ہونا (۷) نفس کو روکنے سے تعبیری کرتے ہیں (۸) ثواب۔

وجوہِ خوف

دیکھ لیجئے کہ اگر استاد یا پیر یا باپ سامنے موجود ہوتو آدمی اُن کے سامنے کوئی ناشائستہ (۱) حرکت نہیں کرتا، تو اس کی کیا وجہ ہے؟ خوف ہی تو ہے جو اس کو مانع (۲) ہو رہا ہے اور یہ خوف دو وجہ سے ہوتا ہے یا تو خوف عقاب (۳) کا یا خوف ناراضی کا یعنی یا تو یہ خوف ہوتا ہے کہ اگر میں اس امر کا ارتکاب کروں گا تو مجھ کو سزا ہوگی اور یہ ڈر ہوتا ہے کہ میرا آقا میرا مولا مجھ سے ناراض ہو جائے گا۔

خوف کے فوائد

خلاصہ یہ کہ کسی ناگوار کے احتمال (۴) سے خوف ہوتا ہے اور وہ امرِ ناگوار ایک سزا ہے ایک سخطِ مولیٰ (۵)۔ پس اس تقریر سے ثابت ہو گیا کہ خشیت مامور بہ کے کرنے اور منہی عنہ کے اجتناب کے لئے مفتاح (۶) ہے۔ چنانچہ دنیا کے معاملات میں اس کے نظائر بکثرت موجود ہیں۔ محکوم جو حاکم کی مخالفت نہیں کرتا اور اس کی اطاعت کرتا ہے ان ہی دو امر کے خوف سے، شاگرد جو استاد کی اطاعت کرتا ہے اُس کی وجہ بھی یہی خشیت ہے، مرید جو مشائخ سے سرتابی نہیں کرتے اس کا باعث بھی یہی ہے۔ اسی طرح خالق تعالیٰ شانہٗ میں بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ جب کبھی مخالفت ہوگی یا کسی فرض و واجب کا ترک ہوگا اس وقت خدا تعالیٰ کا خوف غالب نہ ہوگا (۷) اور یہی وجہ ہے کہ ہم لوگ گناہوں پر دلیر ہیں اور اگر کوئی شبہ کرے

---

(۱) ناپسندیدہ حرکت (۲) روک رہا ہے (۳) سزا کا خوف (۴) کسی ناپسندیدہ بات کے امکان سے خوف ہوتا ہے (۵) آقا کی ناراضگی (۶) اس سے ثابت ہوا کہ خوف خدا حکم کردہ کاموں کے کرنے اور ممنوع کاموں سے رکنے کی چابی ہے (۷) کوئی فرض و واجب جب بھی چھوٹے گا خدا کا خوف نہ ہونے سے چھوٹے گا۔

کہ پھر چاہیئے کہ ہم مؤمن بھی نہ رہیں اس لئے کہ اس پر اتفاق ہے کہ جیسے یاس کفر ہے (۱) اسی طرح خوف نہ ہونا بھی کفر ہے۔

مراتبِ خوف وایمان

حقیقت یہ ہے کہ خوف کے مراتب مختلف ہیں: ایک خوف وہ ہے جو درجۂ اعتقاد میں ہو یہ تو ادنیٰ درجہ ہے اور ایک وہ ہے جو درجۂ حال میں ہو اور جبکہ مدار ایمان کا خوف پر ہے، تو ایمان کے بھی اسی طرح دو مرتبے ہیں: ایک وہ ایمان جو صرف درجۂ اعتقاد تک محدود رہتا ہے یہ تو عوام کا ایمان ہے۔ کہ جب قلب میں ٹٹولتے ہیں تو قیامت، جنت، دوزخ، حساب وکتاب سب کا حق ہونا قلب میں پاتے ہیں اور تحریک وتذکیر، ترغیب وترہیب کے وقت وہی مستحضر (۲) ہوجاتا ہے اور باقی اوقات میں اس سے غافل ہیں۔ سو یہ ایمان اعتقادی موقوف ہے خوف اعتقادی پر۔ اور دوسرا درجہ ایمان کا وہ جو اعتقاد سے متجاوز ہوکر درجۂ حال میں آگیا ہے یہ خواص کا ایمان ہے، کہ ایک خاص حالت ان پر رہتی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ علوم اجمال کے درجہ میں ان کو ہر وقت مستحضر رہتے ہیں کسی وقت نہیں بھولتے، ان کو ایک ملکۂ راسخہ (۳) حاصل ہوجاتا ہے جس کو یادداشت کہا جاتا ہے۔ جیسے کسی کو کسی سے محبت ہوجاتی ہے تو دیکھئے کہ ہر وقت اس کا خیال رہتا ہے یا کسی مقدمہ کا خوف ہوجاتا ہے ہر وقت اس کا دھیان رہتا ہے حتی کہ بیٹھے، لیٹے، کھانا کھانے میں، سونے میں کسی وقت اس کو نہیں بھولتا۔ یا کوئی مرض وبائی پھیلتا ہے تو بعض لوگوں کو ہر وقت اسی کا اندیشہ ہوتا رہتا ہے حتی کہ بعض تو اس خوف کی وجہ سے مر بھی جاتے ہیں۔ اسی طرح جب کسی کو خدا تعالیٰ سے تعلق ہوجاتا ہے تو وہ کسی وقت بھولتا نہیں اور یہ

---

(۱) مایوسی کفر ہے (۲) داعیۂ عمل یاددہانی رغبتِ عمل اور خوفِ عذاب کے وقت اسی کا استحضار ہوتا ہے (۱۰) پختگی

ایمانِ حالی موقوف ہے خوفِ حالی پر بس یہ شبہ جاتا رہا اور اس استحضار کا جو ایمان حالی و خوف حالی سے ہوتا ہے یہ اثر ہے کہ آدمی اس سے ہر وقت متأثر رہتا ہے ایسے بندے مقبول اور اہلِ نسبت کہلاتے ہیں ایسے لوگوں کا ایمان ہر وقت تازہ رہتا ہے۔ مولانا اسی کو فرماتے ہیں ؎

تازہ کن ایمان نہ از گفت زباں　　　اے ہوا را تازہ کردہ درنہاں

"یعنی ایمان کو صدقِ دل سے تازہ کرو صرف زبان سے کہنا کافی نہیں تم نے تو باطن میں خواہشاتِ نفسانی کو تازہ کر رکھا ہے"

ایمان کی تازگی

جناب رسول اللہ ﷺ نے جو ایمان کے تازہ رکھنے کا حکم فرمایا ہے ان حضرات کی حالت و عمل بالکل اسی کے موافق رہتا ہے اور اسی لئے وہ ہر وقت خدمتِ حق کے لئے تازہ رہتے ہیں کسی وقت ملول(۱) نہیں ہوتے۔ یوں طبعی تکان (۲) تو ان حضرات کو بھی بمقتضائے بشریت ہو جاتا ہے مگر قلبی تکان نہیں ہوتا جیسے شوقین طلبہ کسی وقت ملول نہیں ہوتے یعنی جی نہیں اترتا، تھک جاتے ہیں۔ اور جیسے کسی محبوب کی طلب میں عاشق ہر وقت تازہ رہتا ہے، تھک بھی جاتا ہے اور اسی تازگی کے سبب کبھی یاس (۳) اور ناامیدی ان کے پاس نہیں آتی جیسے مولانا فرماتے ہیں ؎

کوئی نومیدی مرو کامیدہا ست　　　سوئے تاریکی مرو خورشیدہا ست

"یعنی ناامیدی کی راہ مت چلو اللہ تعالیٰ سے بہت امیدیں ہیں ظلمت کی طرف مت جاؤ بہت سے خورشید بھی ہیں"

---

(۱) رنجیدہ (۲) تھکاوٹ (۳) مایوسی۔

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ایمان کی خاصیت ہے کہ اس سے ہر وقت تازگی' بشاشت' انشراح (۱) مومن کے قلب میں رہتا ہے اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فَزَادَتۡهُمۡ اِیۡمَانًا وَّهُمۡ یَسۡتَبۡشِرُوۡنَ ﴾(۲)''سو جو لوگ ایمان دار ہیں اس صورت نے تو ان کو ایمان میں ترقی دی ہے اور خوش ہو رہے ہیں''

اشکال کا جواب

اگر کوئی کہے کہ اہلِ سلوک کو قبض (۳) بھی تو پیش آتا ہے تو حقیقت یہ ہے کہ وہ تازگی مذکور اور آثار ایمان کے ان کے قلب میں اس وقت بھی ہوتے ہیں لیکن ان کو قبض کے وقت اس طرح التفات نہیں رہتا اسی واسطے جب وہ کسی محقق سے رجوع کرتے ہیں اور وہ ان کو حقیقت سے آگاہی دیتا ہے تو پھر وہی بشاشت پانے لگتے ہیں کوئی نئی کیفیت پیدا نہیں ہوتی اُسی بشاشتِ سابقہ (۴) کا ظہور ہو جاتا ہے۔ غرض ان حضرات پر اس حالت کا غلبہ رہتا ہے۔ گو ضعف کسی وقت ہو جاتا ہو۔ لیکن مطلق تازگی ہر وقت رہتی ہے۔

خوفِ اعتقادی اور خوفِ حالی

غرض جس طرح ایمان کے دو درجے ہیں ایک اعتقاداً اور ایک حالاً اور اسی طرح خوف چونکہ مدار ایمان کا ہے اُس کے بھی ایسے ہی دو درجے ہیں ایک درجہ اعتقاد کا اور ایک درجہ حال کا' کہ ہر وقت اُس کا اثر غالب رہے اور خوف اعتقادی کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص جو مجسٹریٹ ضلع اور عدالت اور جیل خانے

---

(۱) خوشی و تازگی (۲) سورۃ التوبہ: ۱۲۴ (۳) واردات کا انقطاع جو کسی مصلحت سے ہوتا ہے قبض کہلاتا ہے۔ قبض کے مقابل حالت بسط ہے یعنی آثار لطف و فضل کے ورود سے قلب کو سرور اور فرحت ہونا (۴) تازگی۔

سے غائب ہے کبھی اس کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تو حاکم سے ڈرتا تو وہ بھی ہے، لیکن یہ خوف اعتقاد میں ہے اس پر حالت کا غلبہ نہیں اور ایک وہ شخص کہ حاکم اور مجلس حکم اُس کو ہر وقت پیش نظر ہے اور جیل خانہ اور قیدی اور ہتھکڑی ہر وقت اُس کے سامنے ہے اس پر جس خوف کا غلبہ ہوگا یہ خوف حالی ہے۔

پس عوام کی نسبت یوں نہ کہیں گے کہ خوف نہیں ہے، خوف ضرور ہے، لیکن اعتقادی ہے۔ جو نفسِ ایمان کے لئے کافی ہے البتہ جیسا خوف ہے اُسی درجہ کا اُن میں ایمان بھی ہے اب کوئی اشکال نہیں رہا۔

حدیث کے معنی

اور یہاں سے اس حدیث کے معنی بھی معلوم ہوگئے کہ حدیث میں آیا ہے: ”لَا یَـزْنِیْ الزَّانِیْ وَھُوَ مُؤْمِنٌ وَّلَا یَسْرِقُ السَّارِقُ وَھُوَ مُؤْمِنٌ“ (یعنی نہیں زنا کرتا کوئی زنا کرنے والا اس حال میں کہ وہ مؤمن کامل ہو اور نہیں چوری کرتا کوئی چوری کرنے والا اس حال میں کہ وہ مؤمن کامل ہو) یعنی چوری وزنا کی حالت میں ایمان کامل نہیں رہتا۔ یعنی جس وقت گناہ کیا گیا اُس وقت چونکہ خوف درجۂ حال میں نہیں ہے اس لئے ایمان بھی اسی درجہ کا منفی ہے۔ پس اس حدیث میں کمال ایمان کی نفی ہے نہ کہ نفس ایمان کی نفی، اسی لئے حضرات شراحِ حدیث وسنت نے اس حدیث میں مؤمن کے معنی مومن کامل کیے ہیں، جس کو طلباء محض تاویل سمجھتے ہیں لیکن اس تقریر سے واضح ہوگیا ہوگا کہ حقیقت پر محمول ہے۔ اس لئے کہ تقسیم کا اپنی ہر قسم پر صادق آنا حقیقۃً ہی ہوتا ہے۔ بلکہ عُرفاً تو مطلق کا اطلاق اکثر کامل ہی پر ہوتا ہے۔ مثلاً کھانا ایک لقمہ کو کوئی نہیں کہتا تو اس کا مقتضٰی تو یہ تھا کہ ادنیٰ ایمان کو ایمان ہی نہ کہا جاتا مگر یہ محض حق تعالیٰ کا فضل ہے ایسے ایمان

کو بھی انہوں نے ایمان میں شمار کیا ہے۔ غرض وہ اشکال بِلَوَاحِقِہٖ (۱) بالکل صاف ہوگیا اور یہ تمام تر تقریر حدیث کے متعلق اہل علم کے یہاں موجود ہونے کی وجہ سے کی گئی ہے۔

خوفِ خدا نہ ہونے کی شکایت

اب میں اصل مقصود کی طرف رجوع کرتا ہوں یعنی تقریر ابتدائی سے یہ ثابت ہوا کہ جب آدمی خدا تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے اس وقت خوف نہیں ہوتا۔ یعنی ایسا خوف نہیں ہوتا جیسا کہ ایک کلکٹر کو دیکھ کر چپڑاسی کو ہوتا ہے اور جیسے کسی کو یہ خبر ملی ہو کہ تمہارے گھر کا محاصرہ ہوگیا ہے اگر چہ وہ جانتا ہے کہ میں بری ہوں اور اس محاصرہ سے کچھ نہ ہوگا مگر جو حالت خوف کی اس وقت ہوتی ہے گناہ کرتے ہوئے ایسی نہیں ہوتی۔ افسوس ہے کہ ایک ادنیٰ حاکم جو خدا کے سامنے کسی درجہ میں بھی نہیں اس کا تو اتنا خوف اور مالکِ حقیقی اور احکم الحاکمین (۲) کا خوف کچھ نہیں کہ کس دلیری سے اُس کی مخالفت کرتے ہو۔

خوفِ رسوائی

صاحبو! میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر خدا تعالیٰ تم کو کچھ عذاب بھی نہ دیں صرف کھڑا کرکے اتنا پوچھ لیں کہ ارے ظالم! تجھ کو ہمارا اتنا بھی خوف نہ تھا کہ جتنا اپنے چھوٹوں سے ہوتا ہے تو اس وقت جو ذلت و شرمندگی ہوگی اسی کا خوف گناہ سے بچنے کے لئے کافی ہے کیونکہ ایسے موقع پر آدمی یہ چاہا کرتا ہے کہ بلا سے دوزخ میں چلا جاؤں لیکن یہاں سے مجھ کو خلاصی ہو۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے ” جب

---

(۱) اپنے تمام متعلقات کے ساتھ (۲) تمام بادشاہوں کے بادشاہ۔

سب اوّلین وآخرین قبور سے اٹھائے جائیں گے اور مجرمین کو سخت ذلت و پریشانی ہوگی تو سب بے قرار ہوں گے کہ کسی طرح یہاں سے نجات اور خلاصی ہو اور آپس میں مشورہ کریں گے کہ کیا تدبیر کریں چنانچہ اس پر سب کا اتفاق ہوگا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام چونکہ مقبول بندے اور بے گناہ ہیں اُن کی خدمت میں عرض کریں تاکہ وہ ہماری اس بات میں شفاعت کریں۔ پس سب جمع ہوکر آدم علیہ السلام کی خدمت میں آئیں گے اور عرض کریں گے کہ آپ صفی اللہ ہیں اور آپ کو اللہ نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے آپ دُعا فرمایئے اور شفاعت فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو یہاں سے خلاصی دیں، وہ فرمائیں گے کہ میرا یہ منصب نہیں ہے اور شجر کے کھانے کا عذر فرمائیں گے۔ پھر نوح علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام بھی یہی جواب دیں گے اور اپنے اپنے عذر ذکر کرینگے حتیٰ کہ فخر عالم رسولِ مقبول ﷺ کی خدمت میں آئیں گے۔ آپ ﷺ سب کی شفاعت فرمائیں گے'' کہ اس میدان سے نجات ہو یہ شفاعت کبریٰ کہلاتی ہے اس کے بعد سب کو موقف سے نجات ہوگی اور حساب وکتاب شروع ہوگا اور اس میں مؤمنین وکافرین سب داخل ہیں یہ حدیث حاصل ہے اس میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ سب مؤمنین وکافرین جو اس مقام سے خلاصی چاہیں گے اس کی کیا وجہ ہے یہ تو کہہ نہیں سکتے کہ اُس وقت سب کو یہ گمان ہوگا کہ ہم سب یہاں سے چھوٹ کر بہشت میں چلے جائیں گے اس لئے کہ حقائق وہاں منکشف ہوں گے مغیبات مشاہدہ (۱) ہوں گے چنانچہ فرماتے ہیں: ﴿فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآئَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ﴾(۲) ''سو اب ہم نے تجھ پر سے تیرا پردۂ غفلت اُٹھا دیا، سو آج تیری نگاہ بڑی تیز ہے'' اور کفار کو معلوم ہوگا کہ ہم معذب (۳) ہوں گے تو پھر خلاصی پاکر دوزخ میں جانا کیوں گوارا کیا۔

---

(۱) وہ چیزیں جو آج نظروں سے غائب ہیں سب سامنے ہوں گی (۲) سورہ ق:۲۲ (۳) ہم کو عذاب دیا جائے گا

وجہ اس کی یہی ہے کہ چونکہ وہاں اوّلین وآخرین (۱) جمع ہوں گے اُن سب کے سامنے رُسوا ہونے سے بچنا چاہیں گے۔ طبعی بات ہے کہ آدمی رسوائی سے بچنے کے لئے سزا اور تکلیف کو اختیار کرلیتا ہے اور عام رسوائی میدانِ قیامت میں ہوگی دوزخ میں نہ ہوگی۔

دوزخ میں کفّار کا حال

چنانچہ جلال الدین سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ دوزخ میں ہر کافر کو ایک صندوق میں بند کرکے الگ الگ آگ میں دفن کردیا جائیگا۔ پھر وہاں تاریکی بھی ہوگی کوئی ایک دوسرے کو نہ دیکھے گا۔ ''اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنۡہُ'' (اس سے ہم اللہ کی پناہ لیتے ہیں) اس سے معلوم ہوا کہ دوزخ میں ایسا اجتماع اور ایسا افتضاح (۲) نہ ہوگا۔

میدانِ حشر میں لوگوں کا حال

بخلاف قیامت کے کہ وہاں سب موجود ہوں گے اور نیز اعمال سب کے حاضر ہوں گے ﴿وَجَدُوۡا مَا عَمِلُوۡا حَاضِرًا﴾ (۳) ''جو کچھ انہوں نے کیا وہ سب موجود پائیں گے'' اس کی تفسیر میں حضرت استاذی مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہٗ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ گناہ کو اس کی صورت میں دکھلایا جائیگا۔ مثلاً اہلِ محشر کو یہ معلوم ہوگا کہ چور نقب دے رہا ہے۔ زانی زنا کررہا ہے اور اس کو بعید نہ سمجھا جائے۔ دیکھئے بائیسکوپ میں اچھی خاصی دوڑتی ہوئی صورتیں دکھلائی دیتی ہیں اور دیکھا جاتا ہے کہ وہ تلوار لگی اور سر کٹ گیا اور گولا پھٹا اور توپ چلی۔ جب مخلوق کو

---

(۱) اگلے پچھلے سب لوگ جمع ہوں گے (۲) ایسی شرمندگی نہ ہوگی (۳) سورۃ الکہف: ۴۹۔

ایسی قوت دی ہے کہ وہ واقعاتِ گذشتہ کو ہو بہو دکھلا دیتے ہیں۔ تو کیا خداوند تعالیٰ گناہوں کو ان کی صورت میں نہیں دکھلا سکتے؟ ضرور اس سے زیادہ پر قادر ہیں۔ اور یہ تفسیر حضرت اُستاذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس وقت فرمائی تھی کہ جب یہ آلہ ایجاد بھی نہ ہوا تھا۔ حضرات یہ مضمون تو بڑے خوف کا ہے۔ ہم لوگ جو مولوی بنے ہوئے دوسروں کو نصیحت کرتے ہیں ہماری یہ حالت ہے ؎

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر میکنند
چوں بخلوت میرسند آں کارِ دیگر میکنند

> ”یعنی بے عمل واعظ محراب و منبر پر رونق افروز ہو کر دوسروں کو وعظ و نصیحت کرتے ہیں اور جب خلوت میں پہنچتے ہیں تو دوسرے کام کرتے ہیں یعنی خلاف شریعت کام کرتے ہیں“

پس تو ہمارے وہ اعمال اگر اس طور سے حاضر کئے گئے تو کس قدر رسوائی ہوگی اور جو ہمارے وعظوں کے مخاطب تھے وہ کیا کہیں گے کہ یہ ہمارے ناصح ہیں باتیں کیا کرتے تھے اور کام کیا کرتے تھے اور اگر کوئی کہے کہ یہ تفسیر ظنی ہے تو لیجئے میں دوسری دلیل رسوائی کی پیش کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ فرشتے پکار پکار کر کہیں گے: ﴿وَیَقُوْلُ الْاَشْھَادُ ھٰٓؤُلَآءِ الَّذِیْنَ کَذَبُوْا عَلٰی رَبِّھِمْ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ الَّذِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾⑴ ”اعمال کے گواہ فرشتے یوں کہیں گے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی نسبت جھوٹی باتیں لگائی تھیں، سب سن لو کہ ایسے ظالموں پر خدا کی زیادہ لعنت ہے جو کہ دوسروں کو بھی خدا کی راہ یعنی دین سے روکتے تھے“۔ اور اسی واسطے اُس دن کو اللہ تعالیٰ نے ”یوم التنادِ “⑵

---

(۱) سورۂ ھودؑ آیت: ۱۸۔۱۹ (۲) جس دن فرشتے لوگوں کو پکاریں گے یعنی روزِ قیامت۔

بھی فرمایا ہے غرض وہاں یہ رسوائیاں ہوں گی بس اسی رسوائی سے بچنے کے لئے اس میدان سے کفار بھی خلاصی چاہیں اگرچہ جائیں گے کہ یہاں سے سیدھے دوزخ میں جائیں گے مگر اس حیثیت خاص سے اس کو ''اَہوَن''(۱) سمجھیں گے۔

تو صاحبو! اگر قیامت کے متعلق ہم کو یہ بھی اطمینان دلایا جائے کہ ہم تم کو دوزخ میں نہ بھیجیں گے۔ لیکن یہ ضرور پوچھتے رہیں گے کہ نالائق تو نے یہ کیا کیا کہ جس قدر اپنے چھوٹوں سے ڈرا کرتا تھا اُتنا بھی ہم سے نہیں ڈرا اور وہ پوچھنے کا وقت بھی ہوگا کہ حق تعالیٰ کی تمام صفات جاہ وجلال اور اللہ تعالیٰ کی مالکیت اور قہاریت اور اپنی مملوکیت ومقہوریت پیش نظر ہوگی۔ تو واللہ! یہ بھی مرجانے کی جگہ ہے چہ جائیکہ یہ سوال بھی ہو اور دوزخ بھی ہو اور روحانی ذلت بھی ہو اور جسمانی کلفت (۲) بھی ہو۔ تو کیا یہ مجموعہ بھی خوف کے لئے کافی نہیں؟ حقیقت تو یہ ہے کہ تحصیلِ خوف کے لئے بس اتنا سوچ لینا بھی کافی ہونا چاہیئے کہ اگر تجھ سے یہ سوال ہو گیا تو تیرے پاس کیا جواب ہے اور مجموعہ تو بہت زیادہ درجے میں اکفٰی (۳) ہونا چاہیئے۔ پس اپنے دل میں خوف پیدا کرو جب خوف پیدا ہوگا تو پھر کوئی گناہ نہ ہوگا اس لئے کہ خوف ہی نہ ہونے کی وجہ سے سب خرابیاں ہیں۔ جتنا جتنا خوف پیدا ہوتا جائے گا اسی درجہ کی خرابیاں دفع ہوتی جائیں گی۔

مراتبِ خوف

کیونکہ خوف کے مراتب مختلف ہیں بعض کو تو اتنا ہی خوف ہوتا ہے کہ وہ خوف ان کو صرف کفر سے باز رکھتا ہے اور بعض کو کبائر (۴) سے روکتا ہے اور بعض کو صغائر سے بھی ہٹا دیتا ہے اور بعض پر ایسا خوف ہوتا ہے کہ خلاف اولیٰ سے بھی وہ بچتا ہے

---

(۱) ہلکا سمجھیں گے (۲) پریشانی (۳) بہت زیادہ کافی (۴) گناہ کبیرہ سے روکتا ہے۔

اور بعض جو حیا کی وجہ سے بچتے ہیں تو حیا بھی ایک قسم کا خوف ہی ہے حیا کی وجہ سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ بھی واقع میں ایک خوف کی ہی وجہ سے ہوتی ہے اور وہ خوف اس کا ہوتا ہے کہ دیکھنے والا کیا کہے گا۔ غرض خوف کہو یا حیا اس کا ایک درجہ یہ بھی ہے کہ جب مقبولانِ الٰہی پر جب اس کا غلبہ ہوتا ہے۔ تو بعضے جائز کام بھی وہ نہیں کر سکتے اور کبھی کرتے ہیں تو ان کو تنبیہ بھی کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ پاؤں پھیلائے ہوئے خلوت میں بیٹھے تھے، الہام ہوا کہ او بے ادب ہمارے سامنے پاؤں پھیلائے ہوئے بیٹھا ہے۔

شبہ کا جواب

اس پر اگر کوئی طالب علم شبہ کرے کہ پاؤں پھیلانا جائز ہے یا نہیں، اگر نہیں تو دلیل کیا ہے؟ اور اگر جائز ہے تو عتاب کیوں ہوا؟۔

جواب یہ ہے کہ بلا شبہ جائز ہے لیکن ملامت کی قسمیں مختلف ہیں۔ یہ ملامت گناہ ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ ملامت خصوصیت کی وجہ سے ہے۔ اگر یہ شبہ ہو کہ ہم پوچھتے ہیں کہ اس الہام کو اگر نہ مانیں تو گناہ ہوگا یا نہیں اگر نہ ہوگا تو ملہم اور غیر ملہم میں کیا فرق ہوا؟ (۱) عوام کو بھی گناہ نہیں ہوتا اس کو بھی نہیں ہوا۔ پھر خصوصیت کیا ہوئی اور اگر ہوتا ہے تو الہام بھی حجتِ شرعیہ (۲) ہوا حالانکہ وہ حجتِ شرعیہ نہیں۔ اس کا جواب نہایت قابل قدر ہے وہ یہ ہے کہ الہام کی مخالفت سے گناہ تو نہیں ہوتا ہے مگر دنیا کا ضرر (۳) ہو جاتا ہے اور دنیا کے ضرر کی دو قسمیں ہیں ایک قسم تو یہ ہے کہ مال یا جان کا ضرر ہو جائے۔ سو الہام کی مخالفت میں کبھی یہ ضرر بھی ہو جاتا ہے۔

---

(۱) جس کو الہام ہوا اور جس کو الہام نہیں ہوا اس میں کیا فرق ہے (۲) ایک دلیل شرعی ہوا (۳) دنیا کا نقصان۔

مخالفتِ الہام کا وبال

چنانچہ ایک بزرگ کسی سے ملنے کے لئے چلے الہام ہوا کہ مت جاؤ بیٹھ گئے۔ پھر چلے پھر الہام ہوا کہ مت جاؤ۔ تیسری بار اٹھے تھے کہ ٹھوکر لگی اور گر پڑے بہت چوٹ لگی ان کو بہت تعجب ہوا، تحقیق سے معلوم ہوا کہ وہ شخص بدعتی تھا اگر یہ بزرگ وہاں جاتے تو عوام کے دین میں فتنہ ہوتا۔ دوسری قسم دنیا کے نقصان کی یہ ہے کہ ذوق وشوق میں کمی آجائے اور الہام کی مخالفت سے زیادہ اسی نوع (۱) کا نقصان ہوتا ہے اور ذوق وشوق کو جو دنیا کی شے کہا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک نفسانی کیفیت ''غیر مختص باہل الدین ''(۲) ہے گو وہ بعض احوال میں معین الدین (۳) بھی ہو مگر مطلوب بالذات نہیں بلکہ بعض اوقات اس کا نہ ہونا اس کے ہونے سے زیادہ نافع ہوتا ہے جیسے کوئی نماز پڑھتا ہو لیکن نماز میں اس کا جی نہیں لگتا لیکن وہ جبر کر کے نفس پر نماز پڑھتا ہے یہ شخص اس حالت کے اعتبار سے اس سے افضل ہے جس کو ذوق وشوق ہو۔ کیونکہ یہ زیادہ مجاہدہ کر رہا ہے اور اسی واسطے ثواب بھی اس کا زیادہ ہے۔ اگر کوئی کہے کہ پھر ذوق وشوق کیوں مطلوب ہے، بات یہ ہے کہ خود نفس پر یہ اعتماد نہیں ہے کہ ہر وقت کام کرے گا اور جب اس کے اندر ایک محرک یعنی ذوق وشوق پیدا ہو جاتا ہے تو طاعات آسانی سے ہونے لگتی ہیں۔ پس ذوق وشوق کو خود قربِ الٰہی میں کوئی دخل نہیں لیکن بعض احوال میں معین ہو جاتا ہے۔ غرض فی نفسہٖ یہ دنیا کی چیز ہوئی، پس اگر یہ ذوق وشوق کم ہو جائے گا تو یوں کہیں گے کہ دنیا کا نقصان ہوا اس لئے کہ نفع عاجل (۴) جو دین کا جزء نہ ہو وہ دنیا

---

(۱) اسی قسم کا (۲) وہ ایک نفسانی کیفیت ہے جو اہل دین کے ساتھ خاص نہیں (۳) اگرچہ بعض شکلوں میں دین پر عمل کرنے میں مددگار ثابت ہو (۴) فوری نفع۔

ہی کا نفع ہے اور دین کا نقصان وہ کہلاتا ہے جس پر کوئی سزا یا وعید یا حرمان ثواب ہو۔ اور ذوق وشوق ایسی چیز نہیں۔ پس مخالفتِ الہام سے کبھی کبھی اس قسم کا نقصان ہوجاتا ہے۔ غرض ان بزرگ پر جو پاؤں پھیلانے پر عتاب ہوا پس اسی وقت ان بزرگ نے پاؤں سمیٹ لئے اور ساری عمر نہیں پھیلائے۔ یہ تو ایک پرانے بزرگ کا واقعہ ہے نیا واقعہ لیجئے۔

حاجی امداداللہ صاحبؒ پر ادب کا غلبہ

حضرت حاجی صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خاص خادم بیان کرتے تھے کہ حضرتؒ جب لیٹتے تھے پاؤں نہ پھیلاتے تھے اول اول تو میں سمجھا کہ شاید کوئی اتفاقی بات ہوگی۔ مگر جب مدتوں تک اسی طرح دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ حضرتؒ ایسا قصداً کرتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ حضرت اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ پاؤں نہیں پھیلاتے؟ فرمایا: ''ارے باولے اپنے محبوب کے سامنے کوئی پاؤں بھی پھیلایا کرتا ہے''۔

غلافِ کعبہ اور غلاف روضۂ رسولؐ کا احترام

اور ایک دوسری حکایت ایسے ہی حیا اور ادب کی اور لیجئے وہی خادم کہتے ہیں کہ ایک بار حضرت قدس سرہ کے واسطے ایک شخص نے سیاہ رنگ کا جوتا بھیجا تو حضرت نے اس کو پہنا نہیں میں نے عرض کیا کہ حضرت لوگ تو آپ کے لئے اس واسطے بھیجتے ہیں کہ آپ اس کو استعمال فرمائیں، فرمایا کہ اس کا رنگ سیاہ ہے اور جب سے مجھ کو خانۂ کعبہ کا غلاف سیاہ معلوم ہوا ہے تب سے میں نے سیاہ رنگ کا جوتا نہیں پہنا اس لئے کہ خلافِ ادب معلوم ہوتا ہے اور اسی طرح جب

سے روضۂ اقدس ﷺ کا غلاف سبز دیکھا ہے کیمخت (۱) کا جوتا نہیں پہنا، پس ان حضرات پر خوف اور حیا کا ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ مباحات تک کو ترک کر دیتے ہیں۔

انتخابِ آیت کی وجہ

پس ثابت ہوا کہ ہمارے تمام امراض کا سبب یہ ہے کہ ہمارے دلوں میں خوف نہیں ہے، اس لئے میں نے اس آیت کو اختیار کیا ہے اور گو یہ خوف واجب ہے مگر میں نے بجائے دلائل وجوب کے محض فضیلت کی آیت اس لئے اختیار کی ہے کہ فضیلت سے زیادہ رغبت پیدا ہوتی ہے اور ترغیب کا اثر بہ نسبت ترہیب کے اکثر طبائعِ ضعیفہ میں زیادہ ہوتا ہے۔ اور آجکل طبائع ضعیفہ کی کثرت ہے۔ پس ارشاد ہے: ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یَخۡشَوۡنَ رَبَّھُمۡ بِالۡغَیۡبِ الخ﴾ ”یعنی جو لوگ اپنے رب سے غیب میں ڈرتے ہیں ان کے لئے مغفرت اور بڑا اجر ہے“۔

خوف کا اثر

اب یہاں یہ امر قابل غور اور نتیجہ خیز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ﴿یَخۡشَوۡنَ﴾ کا تعلق لفظ ﴿رَبّھُمۡ﴾ سے فرمایا یعنی یہ فرمایا کہ جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور ”یَخۡشَوۡنَ اللّٰہَ“ نہ فرمایا۔ اس میں تعدیل خوف (۲) کی طرف اشارہ ہے مخلوق کے کلام میں ایسی رعایت نہیں ہوتی ہیں۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام بشر (۳) کا نہیں خالق کا کلام ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ خوف کے اندر دو خاصیتیں ہیں: ایک تو یہ کہ گناہوں سے روکتا ہے۔ جیسے مدلل (۴) پہلے معلوم ہو چکا ہے یہ تو جب ہے کہ خوف درجۂ اعتدال میں ہو اور دوسرا خاصہ یہ ہے کہ طاعت (۵)

---

(۱) گھوڑے یا گدھے کی پیٹھ کا دانے دار چمڑا (۲) یعنی خوف میں بھی اعتدال ہونا چاہئے حد سے زائد نہ ہو کہ مانع بن جائے (۳) انسان (۴) جیسے دلائل سے پہلے معلوم ہو چکا (۵) نیکی۔

سے بھی روک دیتا ہے یہ اس وقت ہے کہ فوق الحد^(۱) ہو دنیوی امور میں ہم اس کی نظائر بکثرت دیکھتے ہیں کہ جب کسی امر کا زیادہ خوف ہوتا ہے تو کام نہیں ہوتا ہے جیسے کوئی شخص کوئی مضمون لکھ رہا ہو اور کوئی ایسا شخص جس کو وہ اپنے استعداد میں زیادہ سمجھتا ہو دیکھنے لگے تو ہرگز نہ لکھا جائیگا امتحان میں وہ طلبہ جن پر ممتحن کا خوف غالب ہو جاتا ہے ناکام ہو جاتے ہیں علی ہذا بہت سے نظائر سے یہ امر ثابت ہے کہ غلبہ خوف میں کام نہیں ہوتا جیسا کہ اگر بالکل خوف نہ ہو تو کام نہیں ہوتا اور اسی لئے زندگی میں حکم ہے: ﴿اِتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا﴾(۲) ''اپنے رب سے ڈرو یعنی خشیت اختیار کرو'' اور مرنے کے وقت ارشاد ہوتا ہے: ﴿لَا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ﴾(۳) ''تم نہ اندیشہ کرو اور نہ رنج کرو اور تم جنت کے ملنے پر خوش ہوؤ''

حاجی صاحب کا ارشاد

اور یہی منشاء ہے اس ارشاد کا کہ جو حضرت حاجی صاحبؒ فرماتے تھے کہ زندگی میں تو خوف کا غلبہ ہونا چاہئیے تاکہ گناہوں سے بچا رہے کیونکہ وہ وقت عمل کا ہے اور موت کے وقت امید کا غلبہ ہونا ضرور ہے اس لئے کہ وہ وقت لقاء حق^(۴) کا ہے اور اللہ تعالیٰ سے امید لے کر ملنا چاہئیے تاکہ بمقتضائے ''اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ'' (یعنی میں اپنے بندے کے گمان کے نزدیک ہوں جو اس کو میرے ساتھ ہے) یہ شخص مورد رحمت ہو^(۵)۔ لیکن غلبۂ خوف سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ حد سے متجاوز ہو جائے یہاں غلبہ مقابلہ میں امید کے ہے یعنی امید سے زیادہ خوف ہو اس لئے کہ پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ جب خوف فوق الحد ہوتا ہے تو وہ مانع طاعات^(۶) بن جاتا ہے۔

---

(۱) جبکہ حد سے زائد ہو (۲) سورۂ لقمان: ۳۳ (۳) سورۂ حم السجدۃ: ۳۰ (۴) اللہ سے ملاقات کا وقت ہے (۵) اس پر اللہ کی رحمت نازل ہو (۶) جب خوف حد سے متجاوز ہوگا نیکی سے روکنے والا بن جائے گا۔

سالکینِ مستہلکین

چنانچہ بہت سے سالکین پر جب خوف کا غلبہ ہوگیا ہے تو طاعات چھوڑ بیٹھے ہیں۔ بعض نے نماز چھوڑ دی ہے، کسی نے ذکر چھور دیا ہے، اصطلاحِ صوفیہ میں ان کو ''سالکینِ مستہلکین''(۱) کہتے ہیں۔ ایسے لوگ مقبول مقرب نہیں ہوتے۔ اور یہ لوگ اپنی خودرائی کی وجہ سے ایسے گڑھے میں گرتے ہیں کہ تمام عمر اس سے خلاصی نہیں ہوتی ایسے وقت رہبر کامل کی ضرورت ہے۔ وہ بہ تدابیر اس مہلکے سے نکال لیتا ہے۔ (۲) اور تدابیر متعلقہ تدبیر باطن بعض مرتبہ ایسی لطیف ہوتی ہیں کہ عوام کا فہم ان کے ادراک سے قاصر (۳) ہوتا ہے بلکہ انکو بادی النظر (۴) میں نامناسب سمجھتے ہیں۔

قبض کا علاج

ایک مرتبہ ایک دوست کو ایسا قبض واقع ہوا کہ ذکر و طاعت و روزہ و نماز میں جی نہ لگتا تھا انہوں نے اپنا حال مجھ کو لکھا میں نے جواب میں لکھا تم خلوت چھوڑ دو ادھر ادھر سیر کرو، دوستوں سے ہنسو بولو۔ نفس کو خوب آرام دو چنانچہ دو تین روز کے بعد وہ حالت جاتی رہی، انبساط ہوگیا۔ بات کیا تھی کہ میری سمجھ میں اس کی وجہ یہ آئی کہ خلوت میں رہتے رہتے طبیعت میں ایک جمود اور خمود (۵) ایسا پیدا ہوگیا ہے کہ اس کی وجہ سے احساس نہیں رہا اور اندیشہ اس کا ہوا کہ زیادہ انقباض (۶) اگر ہوا تو مبادا روزہ، نماز بھی چھوڑ بیٹھیں۔ اس لئے میں نے ان کے لئے بجائے خلوت کے جلوت اور بجائے اعتکاف کے طواف (۷) کو تجویز کیا غرض اس راہ میں بڑے بڑے

---

(۱) ہلاکت میں پڑنے والے سالک (۲) وہ حسن تدبیر سے اس کو میدان ہلاکت سے نکال لیتا ہے (۳) عوام اس تدبیر کو سمجھ نہیں سکتے (۴) سرسری نظر میں (۵) پست ہمتی اور خاموشی (۶) زیادہ تنگی اگر ہوئی تو کہیں نماز روزہ ہی نہ چھوڑ بیٹھیں (۷) تنہائی میں بیٹھنے کے بجائے گھومنے پھرنے کی تجویز دی۔

قصے پیش آتے ہیں کہ ان میں کسی شیخ کامل کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔

خوف کی اقسام

الحاصل غلبۂ خوف کا دوسرا خاصہ یہ ہے کہ آدمی کام سے جاتا رہتا ہے اس کی تعدیل کے واسطے بجائے اللہ کے ﴿ رَبَّهُمْ ﴾ فرمایا اور اس سے تعدیل اس طرح ہوئی کہ آدمی جو کسی سے ڈرتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں ایک تو ایسا ڈرنا ہے جیسے چور کوتوال سے ڈرتا ہے یا مجرم حاکم سے ڈرتا ہے یا جیسے شیر اور بھیڑیے سے ڈرتا ہے کہ یہاں تو محض خوف ہی خوف ہے۔ امید کا نشان ہی نہیں۔

اور دوسری قسم یہ ہے کہ جیسے لڑکا اپنے شفیق باپ سے ڈرتا ہے یہ اور قسم کا ڈرنا ہے کہ اس میں خوف کے ساتھ باپ کی شفقت پر اعتماد کر کے امید معافی کی بھی ہوتی ہے اور اس سے زیادہ واضح مثال اس خوف کے متنوع ہونے کی یہ لیجئے کہ حاکم کا بیٹا حاکم سے بحیثیت حکومت کے تو اور طرح سے ڈرتا ہے اور بحیثیت باپ ہونے کے اور نوع سے ڈرتا ہے۔

پس ﴿ رَبَّهُمْ ﴾ اگر نہ فرماتے تو اللہ کے بعض بندے بوجہ غلبۂ استحضار شانِ جلال وقہاریت کے خوف کی وجہ سے جان ہی دیدیتے اس لئے ﴿ رَبُّهُمْ ﴾ اختیار فرمایا کہ جس ذات سے خوف کی فضیلت بیان ہو رہی ہے وہ تمہارا مربی بھی ہے، تم سے بے تعلق نہیں وہ کوئی شیر یا بھیڑیا نہیں اے میرے مقبول بندو! تم اس قدر خوف کے اندر مت گھلو جیسی مجھ میں شانِ جلال وقہاریت ہے اسی طرح شانِ تربیت بھی تو ہے اسی وجہ سے ﴿ وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ ﴾(۱) ”جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرتا ہے“ میں بھی رَبِّهٖ فرمایا ہے۔

---

(۱) سورۃ النازعات: ۴۰۔

تفسیری نکتہ

اور یہاں ''رَبِّہٖ'' کے ساتھ ایک لفظ مَقَامَ کا اور زیادہ فرمایا۔ اس میں عجیب نکتہ ہے، وہ یہ ہے کہ یہ لفظ خوف کے قائم رکھنے کے لئے بڑھایا ہے، شرح اس کی موقوف ہے ایک مثال پر وہ یہ ہے کہ مثلاً کسی کا باپ اگر حاکم ہو تو جب وہ برسرِ اجلاس ہوگا تو اس کا اور اثر ہوگا۔ اور جب نج (۱) پر ہوگا تو دوسرا اثر ہوگا۔ اجلاس پر تو شانِ حکومت جلوہ گر ہوگی خواہ کوئی سامنے آئے اور نج (۲) پر شانِ شفقتِ پدری کی ظاہر گی اس وقت شانِ حکومت ظاہر نہ ہوگی پس ''مَقَامَ'' کا لفظ بڑھا کر یہ بتلا دیا کہ گو وہ تمہارا رب ہے۔ جس کا مقتضٰی شفقت و رحمت و تربیت ہے لیکن جبکہ وہ قیامت کے دن جلال و قہاریت کے ساتھ ظہور فرمائیں گے تو اس وقت ان کے سامنے کھڑے ہونے کو یاد کر کے اس سے ڈرنا چاہیئے۔

خلاصہ یہ کہ ''مَقَامَ'' کا لفظ خوف دلانے کو بڑھایا اور ''رَبِّہٖ'' تعدیل خوف کے لئے لائے (۳)۔ اسی طرح یہاں ﴿یَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ﴾ ''جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں'' میں اسی تعدیل کے لئے ربوبیت کو یاد دلایا۔

افراط وتفریط میں تعدیل

اور جاننا چاہیئے کہ ''یَخْشَوْنَ رَبَّھُم'' میں ''رَبَّھُمْ'' کا لفظ جیسے کہ جانب افراط کی تعدیل کرتا ہے اسی طرح جہتِ تفریط کا بھی معدل (۴) ہے یعنی نفسِ خوف کے وجود کا بھی محرک (۵) ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ تخویف کی دو قسمیں ہیں

---

(۱) گھر پر ہونا (۲) گھر پر باپ کی شفقت کا ظہور ہوگا (۳) اس خوف میں حالت اعتدال پیدا کرنے کے لئے لائے (۴) خوف کی زیادتی اور خوف کی کمی دونوں کو حالت اعتدال پر لاتا ہے (۵) نفس خوف پیدا کرنے کا بھی باعث ہے۔

ایک تو یہ کہ کسی امر مؤجل (۱) سے خوف دلایا جائے جیسے کہا جائے کہ اگر چوری یا ڈکیتی کروگے تو جیل خانہ جاؤگے اس کا اثر تو ضعیف ہے اس لئے کہ ممکن ہے کہ مقدمہ میں رہا ہوجائیں اور دوسری قسم یہ ہے کہ کسی امر معجّل (۲) سے تخویف ہو مثلاً کسی سرکاری ملازم سے کہا جائے کہ فلاں جرم کا اگر ارتکاب کروگے تو سب سے اول سزا یہ ہوگی کہ تمہاری ملازمت جاتی رہے گی، تنخواہ بند ہوجائے گی اور پھر جیل خانہ جاؤگے۔ یہ مؤثر قوی ہے کیونکہ نوکری کا نفع کہ تنخواہ ہے وہ فی الحال جاری ہے اس کا انقطاع زیادہ مخوف (۳) ہے اسی طرح تعزیرات الٰہیہ (۴) میں بھی سمجھئے کہ اگر یہ کہا جاتا ہے کہ اس گناہ کی سزا یہ ہے کہ دوزخ میں چلوگے اس کا اثر بعض طبائع پر ضعیف ہے اس لئے کہ جانتے ہیں کہ میاں جب قیامت ہوگی دیکھا جائے گا۔ اللہ میاں معاف کردیں گے حتیٰ کہ بعض اوقات پر یہ اثر ایسا ضعیف ہوتا ہے کہ بعضے آدمی بیباکی کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ ایک زمیندار نے کسی غریب آدمی کا ایک کیکر کا درخت کاٹ لیا تھا۔ اس نے کہا کہ میاں صاحب یہاں تو تمہاری چل گئی مگر یاد رکھو قیامت کے دن پکڑے جاؤگے، تو وہ زمیندار کہتے ہیں کہ میاں اتنے آدمیوں میں میں کہاں ملوں گا اس بیباکی کی وجہ یہی ہے کہ قیامت کا اثر قلوب پر بہت ضعیف ہے اور وجہ اس کی یہی ہے کہ قیامت مؤجل (۵) ہے اور اگر مثلاً کہا جاتا ہے کہ اس گناہ کی سزا یہ ہے کہ دنیا میں رزق نہ ملے گا۔ مال واولاد کا نقصان ہوگا، تو چونکہ یہ فوری سزا ہے اس لئے اس کا اثر قوی ہوتا ہے۔

---

(۱) آئندہ کے کام سے (۲) فوری کام سے خوف دلایا جائے (۳) اس کا بند ہوجانا زیادہ خوف کا باعث ہے (۴) اللہ کی مقرر کردہ سزاؤں میں سمجھئے (۵) مؤخر ہے۔

”رَبَّهُمْ“ کی قید کا فائدہ

اب سمجھئے کہ ”رَبَّهُمْ“ سے کس طور سے نفسِ خوف پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ گویا یہ فرماتے ہیں کہ ایسی ذات سے ضرور ڈرنا چاہئیے کہ تمہاری تربیت کا مدار اسی کے ہاتھ میں ہے اس لئے اگر اس سے نہ ڈرو گے تو تمہاری تربیت میں کمی آجائے گی مثلاً روزی نہ ملے گی۔ عافیت جاتی رہے گی۔ سبحان اللہ! کلام اللہ کے ایک ایک لفظ اندر کتنے بے شمار معانی بھرے ہوئے ہیں اور ہمارے ہر مقام پر نظائر بیان کرنے سے یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ کلام اللہ کے اندر پورا لطف اس کو آئے گا جس کی محاورات اور واقعات پر نظر ہو اور استدلال اور فلسفیت کی زیادہ کاوش سے خالی ہو۔

ارتکابِ گناہ سے رزق گھٹتا ہے

اب رہی یہ بات کہ کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ ہم تو گناہوں کے اندر رات دن رہتے ہیں اور ہم کو خوب رزق ملتا ہے۔ نافرمانی سے رزق کبھی نہیں گھٹتا۔ اس کے دو جواب ہیں اول تو نقلی قرآن و حدیث سے مسلمانوں کا چونکہ وہ ایمان ہے اس لئے ان کے لئے تو یہی کافی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا﴾ (۱) ”یعنی جو شخص میری یاد سے اعراض کرے اس کے لئے تنگ زندگی ہے“۔ اگرچہ اس کی تفسیر میں بعض نے کہا کہ ”مَعِيْشَةً ضَنْكًا“ سے مراد یہ ہے کہ قبر میں اس کی حیاتِ اخروی تنگ ہوگی لیکن ”مَعِيْشَةً“ کے لفظ سے متبادر (۲) یہی ہے کہ دنیا ہی کی روزی تنگ ہوجاتی ہے اور ”ابن ماجہ“ میں حدیث ہے کہ بندہ گناہ کرنے سے رزق سے محروم ہوجاتا ہے۔

---

(۱) سورہ طٰہٰ آیت ۱۲۴ (۲) اس لفظ سے یہی معلوم ہوتا ہے۔

مال و دولت سے مقصود کیا ہے؟

دوسرا جواب عقلی ہے اور اس کی اگرچہ بعد قرآن و حدیث کے ضرورت نہیں لیکن ہم ''تَبَرُّعًا'' واقعات سے دکھلاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ رزق میں یہ غور کرنا چاہئے کہ کیا شے مطلوب ہے؟ جائداد اگر مطلوب ہے تو کیوں ہے ڈھیلے (۱) تو مطلوب ہیں نہیں۔ مکان طلب کیا جاتا ہے تو کیوں کیا جاتا ہے اگر کہو کہ مطلوب جائداد سے روٹی کپڑا اور مکان ہے اس میں رہنا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس مقصود کا بھی کوئی مقصود ہے یا کھانا پہننا بذاتہٖ مطلوب ہے اگر کھانا پہننا بذاتہٖ (۲) مقصود ہوتا تو عاریت کے کپڑے اور عاریت (۳) کے گھر میں ایسا لطف کیوں نہیں جیسے اپنے کپڑے پہننے اور اپنے مکان میں رہنے سے آتا ہے۔ معلوم ہوا کہ نفسِ پہننا، کھانا، رہنا مقصود نہیں کوئی اور شئے مطلوب ہے، وہ کیا ہے؟ وہ ہے لذت راحت حلاوت۔ چونکہ اپنا کپڑا پہننے میں اپنے مکان میں رہنے میں زیادہ لطف آتا ہے۔ اس لئے وہ مطلوب ہے، لڑکپن میں، میں ایک مرتبہ والد صاحب کی خدمت میں دیوبند سے گیا ہوا تھا۔ وہاں عید یا بقرعید آ گئی اور اس کے کپڑے میرے ہمراہ نہ تھے اور مجھ کو بعض اعزّہ کے عاریتی کپڑے ملنے لگے تو مجھ کو کلفت (۴) ہوتی تھی اور اپنے مستعمل کپڑوں میں زیادہ لطف معلوم ہوتا تھا۔ مگر بعض بے حِس بھی ہوتے ہیں جس طرح بعض عورتیں محض مٹکانے چمکانے کے لئے پرایا زیور لیجاتی ہیں۔ اور اس کو اپنا ظاہر کرتی ہیں کتنی سخت بیہودہ حرکت ہے اچھی خاصی ریا اور نمائش ہے۔

---

(۱) اینٹ پتھر وغیرہ (۲) اپنی ذات کے اعتبار سے (۳) مانگے ہوئے کپڑے (۴) پریشانی۔

حقیقی راحت وسکون اللہ کے ذکر میں ہے

غرض دنیا کی تمام چیزوں سے مقصود جمعیت وسکون قلب ہے اب میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جمعیت کسی ایسی شے میں نہیں جس کو راحت وسکون لوگ سمجھتے ہیں۔ یہ سب عین پریشانی ہے۔ چنانچہ اہل دنیا کو دیکھ لو کہ رات دن ان کو ادھیڑ بن تو لگی رہتی ہیں کسی وقت بھی آرام میسر نہیں ۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جمعیت و سکون حقیقی صرف اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں ہے۔ اگر شک ہو تو تین دن ہی فرمانبرداری کرکے دیکھ لو اور یہ التزام کرو کہ تمام منہیات(۱) سے تین دن تک مجتنب(۲) رہیں گے پھر قلب کی پہلی حالت اور موجودہ حالت میں موازنہ کرلو یقیناً فرق معلوم ہوگا اور اگر پھر بھی حِس نہ ہو تو پھر اپنی مثال ایسی سمجھ لو کہ جو مینڈک تمام عمر گندہ چوبچہ(۳) میں رہا ہو اس کو کیا معلوم ہو کہ سمندر میں کیا ہے؟ اسی طرح جس نے حلاوت(۴) باطن نہ دیکھی ہو وہ اس کا کیا ادراک کرے؟

بے حسی اور اس کا ادراک

اگر کوئی کہے کہ ہم تو شب وروز اپنے دنیا کے کاموں میں اور بال بچوں میں ہنسی خوشی رہتے ہیں۔ ہم کو تو کچھ بھی پریشانی نہیں تو اس کے جواب میں پھر میں بھی کہوں گا کہ واللہ حِس نہیں دنیا کے اندر اتنا انہماک ہے کہ حس بھی باطل ہوگئی اس کا فیصلہ بہت سہل(۵) ہے۔ تم ایک ہفتہ کے واسطے اپنے صغیرہ وکبیرہ گناہوں سے توبہ کرو اور واجبات وفرائض کا التزام کرو ایک ہفتہ اس حالت میں گذارنے کے بعد جو پھر اپنی اصلی حالتِ قبیحہ کی طرف عود(۶) کروگے تو اس حالتِ حَسَنُ(۷) کو یاد کرکے یہ کہو گے ؎

---

(۱) تمام ممنوع باتوں سے (۹۲رک کر دیکھ لو (۳) گٹر کے گندے پانی میں رہا ہو (۴) باطنی مٹھاس (۵) آسان ہے (۶) بری حالت کی طرف جب لوٹو گے (۷) اچھی حالت۔

خوشا وقتی و خرم روزگارے
کہ یارے برخورد از وصل یارے

''وہ کیسا اچھا وقت اور پر لطف زمانہ تھا کہ اس میں محبّ اپنے محبوب کے وصل سے متمع ہو رہا تھا''

اور یہ کہو گے:

ع کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اور اُس ہفتے کی لذت یاد آئیگی حتی کہ اس کا یہ اثر ہوگا کہ پھر اسی ہفتے کی طرف عود کرو گے ممکن نہیں کہ مقناطیس کشش نہ کرے۔ تو یہ کیا شئے ہے جس کو وہ ڈھونڈتا ہے وہ یہی جمعیت خاطر ہے۔

فرمانبردار اور نافرمان کے خوف کا فرق

اور ایک بڑی خاصیت فرمانبرداری میں یہ ہے کہ دل بڑا قوی رہتا ہے اور حق تعالیٰ سے اس کو وحشت نہیں ہوتی۔ ایک عیسائی لکھتا ہے کہ مسلمان کے پاس یہ بڑی دولت ہے کہ وہ اپنے خدا سے شرمندہ نہیں یعنی جیسے نافرمان وحشت سے جان چراتا ہے منہ چھپاتا ہے' مطیع اس سے محفوظ ہے۔ دیکھ لیجئے کہ کسی تحصیل میں تحصیلدار اپنا منصبی کام نہ کرتا ہو۔ یا رشوت ستانی میں بدنام ہو یا سست ہو' کام اس کا خراب ہو اور ایک دوسری تحصیل کا تحصیلدار کارگزار اور ہر کام کو وقت پر کرنے والا ہو اور دونوں تحصیلوں میں صاحب کلکٹر اطلاع کریں کہ ہم فلاں تاریخ تحصیل کا معائنہ کریں گے تو اول تحصیلدار کی تو سنکر ہی روح فنا(۱) ہو جائیگی اور اسی وقت سے وحشت سوار ہوگی کہ دیکھئے کیا پیش آتا ہے اور اپنے سزایاب ہونے کا خیال ہوگا اس لئے وہ یہ بھی نہ چاہیگا کہ حاکم کا سامنا ہو اور جو تحصیلدار اپنا کام کرتا ہے

---

(۱) دم نکل جائے گا۔

اس کو خوشی اور مسرت ہوگی کہ مدت کے بعد وہ وقت آیا کہ میری کارگزاری حاکم کے روبرو پیش ہوگی۔ گو حاکم کے حاکمانہ انداز سے وہ بھی ڈرتا ہے لیکن اس کا ڈرنا اور نوع کا ہے۔ اسی طرح فرماں بردار اور نافرمان بندے کو سمجھ لیجئے۔

اطاعت کا خاصہ

اور یہ نہ سمجھا جائے کہ مطیع کو اپنے اعمال پر ناز ہے۔ بات یہ ہے کہ طاعت میں خاصیت ہی ہے کہ اس سے مطاع کے ساتھ انس اور محبت اور اس کا شوق بھی بڑھتا ہے اور یہی راز ہے کہ اللہ والوں کو موت کا ہر وقت شوق رہتا ہے کہ کسی طرح جلدی وہ دن آجائے اور ہم اپنے محبوب حقیقی سے جاملیں۔ ان کی ایسی مثال ہے جیسے ایک طوطا کسی پنجرے میں مقید ہو باغ میں اور دوسرے طوطے آتے سیر کرتے پھرتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر وہ بھی پھڑ پھڑاتا ہے اور تمنا کرتا ہے کہ کاش میں اس پنجرے سے رہائی پاؤں اور ان کی طرح آزاد ہوجاؤں، پس یہ قالبِ خاکی (۱) مثل پنجرے کے اور طائر روح (۲) مثل طوطے کے ہے۔ روح ان حضرات کی چاہتی ہے کہ کسی طرح اس جسم کی قید سے نکل جائے اور دوسرے طائران عالم قدس میں جاملے اور ایک طوطا وہ ہے کہ پنجرے میں وہ بھی قید ہے لیکن پنجرے کے چاروں طرف بلیاں بیٹھی ہیں کہ یہ نکلے تو ہم اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرڈالیں تو وہ اس پنجرے ہی کو غنیمت سمجھتا ہے اور وہاں سے نکلنا نہیں چاہتا یہ مجرم کی مثال ہے۔

---

(۱) یہ خاکی جسم (۲) انسانی روح۔

اہل اللہ کا حال

غرض بعض تو اس پنجرو قالب سے نکلنا چاہتے ہیں اور وہ اہل اللہ ہیں اس لئے کہ ان کو اس کا شوق ہے کہ یہاں سے خلاصی پاتے ہی عالم ارواح کی سیر(۱) اور حق تعالیٰ کا قرب یا کیف نصیب ہو اور اس شوق میں وہ زبانِ حال یا مقال سے یہ کہتے ہیں ۔

خرم آنروز کزیں منزلِ ویران بروم   راحت جاں طلبم وز پئے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے   تا در میکدہ شاہ داں وغزلخواں بروم

”وہ دن بہت ہی اچھا ہے کہ اس سرائے فانی سے میں کوچ کر کے محبوب حقیقی کے روبرو جاؤں
میں نے نذر مانی ہے کہ اگر یہ غم انجام کو پہنچ جائے اور کوچ کا وقت آجائے تو اس کے شکرانے میں محبوب کے دربار تک خوش وخرم اور غزلیں پڑھتا ہوا جاؤں“

گناہگاروں کا حال

اور بعض اس پنجرے سے نکلنا نہیں چاہتے بلکہ نہ نکلنے کو چاہتے ہیں اس لئے کہ انکی روح کو بوجہ اپنے کرتوتوں کے ادراک ہے کہ یہاں سے نکلتے ہی پا بزنجیر ہونا پڑے گا اس لئے موت کے نام سے بھی ان کو نفرت ہے دہلی۔ کے بعضے بادشاہوں کا قصہ سنا ہے کہ موت کا نام بھی ان کے دربار میں نہ لیا جاتا تھا بلکہ جنازہ نکالنے کے لئے ایک خاص دروازہ بنایا گیا تھا اور اس کا نام خضر دروازہ رکھا گیا تھا۔ بعض لوگ سورۂ یٰسین شریف پڑھنے سے بلکہ سننے سے گھبراتے ہیں اس لئے کہ

---

(۱) یہاں سے جان چھوٹے تو عالم ارواح کی سیر کریں۔

مردوں پر پڑھی جاتی ہے۔ مؤمن خاں شاعر سے رمضان شریف میں ایک ڈوم نے کہا تھا کہ تراویح میں جس دن وہ سورۃ آئے جو مردوں پر پڑھی جاتی ہے تو مجھ کو پہلے سے اطلاع کر دیجیو اس کا یہ اعتقاد تھا کہ سورۂ یٰسین شریف سننے سے مر جاتا ہے مؤمن خان نے ایک دن براہ مزاح کہا کہ میاں وہ سورۃ تو رات آچکی' سنتے ہی بخار چڑھ آیا اور دو تین دن بعد مر گیا تو بعضے موت سے اتنا گھبراتے ہیں کہ اس گھبراہٹ میں ہی ان کو موت بھی آجاتی ہے بوڑھے سے بوڑھا بھی جینے کی تمنا کرتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ یہاں ایک بوڑھیا تھی اس کو کسی لڑکی نے کہدیا کہ بڑھیا مر جا۔ بہت برا مانا اور کسی سے شکایت کی کہ سنا بھی فلانی مجھ کو یہ کہتی ہے کہ تو یوں ہو جا۔ اللہ اکبر کس قدر موت سے کراہت تھی کہ اس کا نام بھی نہیں لیا' بخلاف بزرگانِ دین کے کہ ان کو موت کا شوق ہوتا ہے۔

اطاعتِ خداوندی میں راحت ہے

ایک بزرگ نے زمانہ طاعون میں لوگوں کو بھاگتے دیکھا معلوم ہوا کہ طاعون سے بھاگ رہے ہیں تو شوق و تعجب سے فرماتے ہیں: ﴿یَا طَاعُوْنُ خُذْنِیْ اِلَیْكَ﴾ ’’یعنی اے طاعون تو مجھ کو پکڑ لے‘‘ یعنی یہ لوگ اس دولت کے قابل نہیں' مجھ کو یہ دولت نصیب ہو جائے گویا ان کی یہ کیفیت تھی کہ بزبان حال یہ کہتے تھے ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت   سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

’’دشمنوں کا ایسا نصیب نہ ہو کہ تمہاری تلوار سے ہلاک ہوں۔ دوستوں ہی کے سر سلامت رہیں کہ آپ ان پر خنجر آزمائیں‘‘

غرض فرمانبرداری وہ شئے (۱) ہے کہ اس سے حیات میں بھی حلاوت (۲)

---

(۱) وہ چیز ہے (۲) زندگی میں بھی مٹھاس۔

ہوتی ہے اور موت میں بھی۔ اور نافرمانی وہ بلا ہے کہ خواہ کتنا ہی سامانِ عیش ہو حتی کہ سلطنت بھی ہو مگر پریشانی ہی پریشانی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ فرمانبردار امیر کبیر ہوتے ہیں اور نہ یہ دعویٰ ہے کہ فرمانبردار پر کوئی مصیبت نہیں آتی ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ جو مقصود اصلی ہے امیری اور تونگری کا(۱) یعنی راحت اور سکون اور جمعیت وہ ان ہی حضرات کو حاصل ہے حتی کہ مصیبت میں بھی اور جو حقیقت ہے مصیبت کی یعنی پریشانی قلب وہ ان کے پاس نہیں آتی اگرچہ صورۃً مصیبت میں ہوں۔

اطاعت گذار اور نافرمان کی حالت میں فرق

اور یہ بہت کھلی بات ہے دیکھ لو اگر دو شخص ہوں ایک ان میں سے مطیع ہو اور اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار ہو اور دوسرا نافرمان اور محبِّ دنیا ہو اور دونوں کے مثلاً دو بیٹے جوان ایک عمر اور ایک لیاقت کے ہوں اور وہ دونوں بتقدیرِ الٰہی مرجائیں۔ رنج طبعی دونوں کو ہوگا۔ لیکن غیر مطیع پریشانی حسرت وارمان میں مدتوں گھلے گا۔ اور مطیع یہ کہے گا ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ﴾ ”یعنی ہم سب اللہ تعالیٰ کے مملوک ہیں اور ہم سب لوگ اسی کی طرف جانے والے ہیں“ پھر یہ پریشانی کا ہے کو؟ پریشانی اس کے پاس نہ آئے گی اس لئے کہ وہ سمجھے گا کہ جو کچھ واقع ہوا عین مصلحت اور حکمت ہے۔ غرض فرمانبردار کسی حال میں گھبراتا نہیں۔

مفتی عنایت احمد صاحب کیفیتِ اطمینان

میں نے عبدالرحمٰن خاں صاحب مالک مطبع نظامی سے سنا ہے کہ مولانا مفتی عنایت احمد صاحب مرحوم حج کو تشریف لے گئے تھے۔ طوفان آیا جہاز ڈوبنے لگا اور پانی چاروں طرف سے غرغراس میں آرہا تھا تمام مخلوق جو اس میں تھی سخت

---

(۱) مالداری کا۔

پریشانی میں تھی اور مفتی صاحب مرحوم ایک جگہ اطمینان سے بیٹھے ہوئے اس آیت کا تکرار فرما رہے تھے ﴿قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَا اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلٰنَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾(۱) ”اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپؐ ان سے فرما دیجئے کہ ہم کو ہرگز کچھ مصیبت نہ پہنچے گی مگر جو اللہ نے ہمارے لئے لکھدی ہے وہ ہمارا مولا ہے اور اللہ ہی پر مؤمنوں کو بھروسہ کرنا چاہئیے“۔ حتی کہ مصیبت میں بھی یہ تفاوت تھا۔ مصیبت میں اور نعمت کی حالت میں بھی مطیع اور غیر مطیع کے درمیان تفاوت ہے۔

کھانے کی اصل لذت مطیع کو حاصل ہے

یعنی نافرمان کو نعمت میں بھی پوری لذت نصیب نہیں بلکہ وہ بھی فرمانبردار ہی کو حاصل ہوتی ہے حتی کہ طعام کے اندر بھی اس کو وہ لذت آتی ہے کہ دوسرے کو نہیں آتی لوگوں کو سن کر حیرت ہوگی کہ فرمانبرداری کو کھانے کے مزے کے اندر کیا دخل ہے لیکن تھوڑا سا غور فرمائیں گے تو سمجھ میں آجائے گا۔ دیکھئے جب کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو اس کی ہر شے پیاری معلوم ہوتی ہے خواہ وہ شئے خراب ہی ہو۔ مثلا دو انبہ (۲) میں ایک تو اپنا خریدا ہوا۔ اور ایک محبوب نے دیا ہو دونوں میں بڑا فرق ہے۔ محبوب کے دیے ہوئے انبہ کو اگرچہ وہ ترش (۳) ہی ہو جس رغبت سے کھائے گا اپنے انبہ کو اس طرح نہ کھائے گا اور اس میں مزہ بھی بہت آئے گا۔ اس لئے کہ وہ مزہ نرے انبہ کا نہیں بلکہ وہ اس نسبت کا ہے کہ محبوب کا دیا ہوا ہے۔ پس ایسے ہی یہاں بھی سمجھ لیجئے کہ جس کو حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق ہو گیا ہے اس کو ہر نعمت میں بے حد مزہ آئے گا کہ یہ میرے محبوب نے مجھ کو عطا فرمائی ہے اس کو سوکھی روٹی میں وہ

---

(۱) سورۃ توبہ: ۵۱ (۲) آم (۳) کھٹے ہی کیوں نہ ہو۔

لطف آئے گا جو دوسروں کو پلاؤ قورمہ میں نہیں آتا اور حرام خور نافرمان اَناج کی کوٹھیاں اور پانی کے تالاب خالی کردیتے ہیں اور کبھی دل میں تو کیا زبان پر بھی یہ نہیں آتا کہ معطی حقیقی کا شکر کریں اور ان نعمتوں کو اس کی طرف سے سمجھیں پھر وہ اس نسبت کی لذت سے بھی محروم ہیں اور نعمت تو نعمت فرمانبردار کو تو میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ مصیبت اور تکلیف میں بھی مزہ آتا ہے جیسے محبّ کو محبوب(۱) کی مار میں بھی لطف آتا ہے اب تو آپ کو معلوم ہوا کہ نافرمانی میں معیشت کے تنگ ہونے کے کیا معنی ہیں اور یہ بھی ثابت ہوگیا کہ ’’ رَبَّھُم ‘‘ جیسا کہ افراط خوف کو درجۂ توسط پر لانے والا ہے اسی طرح نفسِ خوف کو بھی درجۂ تفریط سے ترقی دینے والا ہے اور خشیت پر مغفرت واجر کبیر کے مرتب کرنے سے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا ہوگا کہ اگر خشیت نہ ہوگی تو ان کے لئے مغفرت اور اجر کبیر کا وعدہ نہیں۔

خشیت، مغفرت اور اجر کبیر میں جوڑ

اب یہ سمجھنا چاہئے کہ خشیت، مغفرت اور اجر کبیر میں کیا جوڑ ہے کہ اللہ تعالیٰ خشیت پر ان دونوں کو مرتب فرمایا۔ تو ربط کی دو وجہ ہوسکتی ہیں اول تو یہ کہ خشیت ایک حسنہ(۲) ہے اور یہ ثابت ہے کہ ﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّئَاتِ﴾(۳) ’’یعنی نیکیاں گناہوں کو مٹادیتی ہیں‘‘ اس علاقہ سے مغفرت من الذنب(۴) اور اجر کبیر اس کے لئے لازم ہے دوسری وجہ ربط کی یہ ہے کہ جب خشیت ہوگی تو گناہوں سے توبہ کرنا اس کے لیے لازم ہے اور نیز تمام اعمال صالحہ کا اختیار کرنا بھی لازم ہے ’’کَمَا مَرَّ فِی التَّمْھِیْدِ مِنْ اِنَّ الْخَشِیَّةَ مِفْتَاحُ الْاَعْمَالَ الصَّالِحَةِ ‘‘

---

(۱) عاشق کو معشوق کی مار بھی پیاری ہے (۲) نیکی (۳) سورۂ ھود: ۱۱۴ (۴) گناہوں سے معافی۔

(جیسے تمہید میں گزرا کہ خشیت اعمال صالحہ کی کنجی ہے) اور ظاہر ہے کہ توبہ کو حسب وعدۂ مغفرت لازم ہے اور اعمال صالحہ کو اجر کبیر ''وَلَازِمُ اللَّازِمِ لَازِمٌ'' (لازم کا لازم بھی لازم ہوتا ہے) اور یہ دوسری وجہ ربط کی وجداناً (۱) زیادہ قریب ہے تو حق تعالیٰ کا مقصد یہ ہے کہ ایسی خشیت پیدا کرو کہ جس سے ایسا سامان ہو جائے (توبہ واعمال صالحہ کی توفیق ہو جائے) کہ اس پر مغفرت اور اجر کبیر مرتب ہو۔

تفسیری نکتہ

اور چند کہ واؤ سے عطف کرنا ترتیب کو مفید نہیں لیکن ترتیب ذکری بھی کسی نکتہ سے خالی نہیں ہوتی پس مغفرت کو پہلے لانے اور اجر کبیر کو بعد میں لانے کے اندر نکتہ ہو سکتا ہے کہ خشیت کے مقتضٰی میں بھی ترتیب ہوتی ہے چنانچہ جس کے اندر خشیت ہوگی وہ اول اپنے معاصی سے توبہ کرے گا، اس پر تو مغفرت مرتب ہوگی۔ اور پھر اعمالِ صالحہ کو اختیار کرے گا، اس پر اجر کبیر متفرع ہوگا۔

علم کی کمی کا نقصان

اب ہم کو چاہئے کہ ہم بھی یہی ترتیب اختیار کریں کہ توبہ اسی وقت کر لیں پھر اعمال صالحہ میں سے جس جس کا وقت آتا رہے اس کو بجالاتے رہیں اس لئے کہ گناہ تو ہر وقت ہی ہوتے رہتے ہیں۔ اس لئے توبہ بھی ہر وقت ہی کرنا ضروری ہے اس کے لئے کسی وقت کا انتظار کیوں کیا جائے اس کو سنکر اگر کوئی مدعی تقویٰ کہے کہ ہم سے تو کوئی بھی گناہ نہیں ہوتا، یہ کہ ہر وقت ہوتا ہو۔ میں کہتا ہوں کہ یہ غلط ہے گناہ ہوتے ہیں مگر سمجھ میں اس لئے نہیں آتا پورا علم نہیں چنانچہ شادی کی رسوم کے متعلق جب

---

(۱) ذوق کے اعتبار سے۔

نصیحت کی جاتی ہے تو اکثر یوں کہنے لگتے ہیں کہ کیا ہم نے ناچ کرایا ہے۔ یہ تمام تر علم نہ ہونے کی خرابی ہے کہ دین کی خبر ہی نہیں یہ سمجھتے ہیں کہ بس ناچ کرانا، گناہ ہے۔ صاحبو! جس طرح ناچ کرانا گناہ ہے۔ اسی طرح فخر کے واسطے کھانا کھلانا، دینا دلانا یہ سب بھی منع ہے اور ظاہر ہے شادی اور غمی کی رسوم اکثر تفاخر ونمائش ہی پر مبنی ہیں پھر گناہ نہ ہونے کے کیا معنی؟ پس یہ تمام خرابی علم سے ناواقفیت کی ہے کہ گناہ کو گناہ نہیں جانتے ورنہ اگر پورا علم ہو تو ایک لحظہ بھی معصیت سے خالی نظر نہ آئے کیونکہ گناہ جوارح(۱) کے الگ ہیں قلب(۲) کے الگ پھر ہر ایک میں بے انتہا جلی اور دقیق شعبے ہیں(۳)۔ ذرا احیاء العلوم کو یا اس کے ترجمے کو تو پڑھ کر دیکھو یا سن کر کہ اس کی تصدیق ہو جائے گی مگر بوجہ جہل کے بعضے اپنے کو ایسا بری سمجھتے ہیں کہ ان پر جب کوئی تکلیف یا مصیبت آتی ہے تو بعضے کہا کرتے ہیں کہ خدا جانے ہم سے کیا گناہ ہو گیا تھا جس میں ہم پکڑے گئے۔ صاحبو! تم کو بجائے اس کے کہ مصیبت پر تعجب ہوتا ہے کہ کس گناہ سے آئی اگر ان نعمتوں پر تعجب ہوتا جو تم کو مل رہی ہیں اور صحیح وسالم چین سے زندگی بسر کر رہے ہیں ہلاک نہیں کر دیے جاتے تو یہ زیادہ زیبا ہوتا۔ ہمارے اعمال تو ایسے ہیں کہ ہم کو ایک ٹکڑا روٹی کا اور ایک گھونٹ پانی کا بھی نہ ملنا چاہئے۔

توبہ کی ہر وقت ضرورت ہے

اور بعض حضرات ایسے ہیں کہ جب کوئی گناہ ہوتا ہے تو شیطان پر لعنت کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ شیطان بہکاتا ہے یاد رکھو کہ چوری جب ہوتی ہے گھر کے

---

(۱) اعضاء کے گناہ (۲) دل کے گناہ (۳) پھر ہر ایک کے بہت سے شعبے ہیں کچھ ظاہر کچھ پوشیدہ۔

بھیدی کے بھید دینے سے ہوتی ہے اسی طرح گناہ جب ہوگا تو آپ کے اندرونی دشمن کی سازش سے ہوگا۔ وہ کون ہے؟ نفس میں قسمیہ کہتا ہوں کہ نفس ہمارا اصلاحیت پر آجائے تو اگر ساری دنیا بھی شیاطین سے پر ہوجائے تو کچھ ضرر نہیں اصلی دشمن تو یہ ہے ہر وقت ہم سے گناہ کراتا رہتا ہے۔ اس لئے ہر وقت توبہ کرنا ضروری ہے۔ حضور ﷺ سے زیادہ کون ہوگا جن کی شان ہے: ﴿لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ﴾(۱) ”تا کہ اللہ تعالیٰ آپ کی سب اگلی پچھلی خطائیں معاف کردے“ اور جن کو خطاب ہے ﴿اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾(۲) ”بے شک آپؐ اخلاق حسنہ کے اعلیٰ پیمانہ پر ہیں“۔ باوصف اس عظمت اور علو مرتبہ کے آپ فرماتے ہیں: ”إِنِّیْ لَاَسْتَغْفِرُاللّٰهَ فِی الْيَوْمِ سَبْعِيْنَ مَرَّةً اَوْ كَمَا قَالَ صلى اللّٰه عليه وسلم“ (میں اللہ سے دن بھر میں ستر مرتبہ استغفار کرتا ہوں) اور ہم باوجود سرتاسر گناہوں میں غرق ہونے کے دن بھر میں ایک مرتبہ بھی توبہ نہیں کرتے۔

توبہ نہ کرنے کا بہانہ

اور اُس کا ایک عجیب حیلہ یہ نکال رکھا ہے کہ توبہ اس لئے نہیں کرتے کہ پھر گناہ ہوجائے گا۔ صاحبو! یہ شیطان کی شراب ہے کہ اس کو پلا کر اس نے ہم کو غفلت میں ڈال دیا اور اس کو ایک خصلت حمیدہ (۳) اور پختگی سمجھتے ہیں کہ گویا اُن کے دل میں توبہ کی بڑی عظمت ہے کہ توبہ کرکے پھر گناہ کو پسند نہیں کرتے ہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میاں توبہ ہی کہاں کی تھی سو یہ امر توبہ سے بڑا مانع (۴) ہے۔ اکثر لوگ اسی میں مبتلا ہیں چنانچہ کہتے ہیں کہ ہم دنیا دار آدمی ہیں ہماری توبہ ہی کیا ہے۔ اگر توبہ کرلی تو وہ ٹوٹ جائے گی۔

---

(۱) سورۃ الفتح: ۲ (۲) سورۃ نٓ: ۵ (۳) اچھی عادت کر کے پیش کیا (۴) پس یہ بات توبہ سے روکنے والی ہے۔

بار بار توبہ کرنے کا فائدہ

جواب اس کا یہ ہے کہ ٹوٹ جائے گی پھر توبہ کر لیجیو۔ اگر کوئی کہے کہ پھر توبہ سے کیا فائدہ؟ فائدہ یہ ہے کہ جن گناہوں سے توبہ کرتے جاؤ گے وہ تو صاف ہوتے جائیں گے۔ جرائم کے اندر زیادتی تو نہ ہوگی۔ دو شخصوں کی اگر پچاس پچاس برس کی عمر اور دونوں نے برابر گناہ کئے ہوں گے مگر فرق یہ ہو کہ ایک تو برابر توبہ کرتا رہا اور دوسرے نے توبہ نہیں کی تو دونوں کے مواخذے میں فرق عظیم ہوگا۔ یہ فرق تو آخرت کے اعتبار سے ہے۔ اور ایک فائدہ عاجلہ (۱) بھی ہے وہ یہ کہ بار بار توبہ کرنے میں اللہ تعالیٰ نے یہ خاصیت رکھی ہے کہ چند روز میں بتدریج وہ گناہ چھوٹ جاتا ہے پس یہ توبہ کی برکت ہے کہ اس سے تائب آخر کار متقی پرہیزگار ہو جاتا ہے۔ غرض اگر گناہ اور توبہ دونوں کے سلسلے برابر جاری رہیں تب بھی انشاء اللہ تعالیٰ گناہ کا سلسلہ مٹ جائے گا اور توبہ کا سلسلہ بمقتضائے ”سَبَقَتْ رَحْمَتِیْ عَلٰی غَضَبِیْ“ (میری رحمت میرے غضب سے بڑھ گئی) غالب آ جائیگا۔ جیسے سلیٹ کی لکھائی ہے کہ پانی سے مٹ جاتی ہے اسی طرح گناہ بھی آبِ رحمت سے مٹ جائیں گے۔

مضمون کا مخاطب کون؟

لیکن اس سے گناہوں پر دلیر نہ ہونا چاہئے اس لئے کہ میرا مقصود تو اس سے یہ ہے کہ جو شخص چاہتا ہے کہ میں گناہ نہ کروں اور نفس سے کشاکش ہوتی ہے۔ کبھی یہ غالب ہوتا ہے کہ باوجود تقاضائے شدید کے نفس کے مقتضٰی پر عمل نہیں کرتا

---

(۱) ایک فائدہ نقد ہے۔

اور کبھی بمقتضائے بشریت اس پر نفس غالب آجاتا ہے اس سے کڑھتا ہے اور روتا ہے اور توبہ کرتا ہے اور پھر گناہ ہوجاتا ہے وہ پھر ایسا ہی کرتا ہے اور اس کی ہمت ٹوٹنے کی ہوتی ہے' ایسے شخص کی ہمت بندھانے کے لئے یہ مضمون بیان کررہا ہوں کہ ایسا شخص اس تدبیر سے انشاء اللہ تعالیٰ ایک نہ ایک دن ضرور متقی پرہیزگار ہوجائے گا۔ اگر نہ بھی ہو لیکن مغفور تو انشاء اللہ ہو ہی گا۔ باقی جو پہلے سے گناہ میں دلیر ہے۔ اور اس کو کچھ غم ہی نہیں۔ اس کے غم کے علاج ہی کی کیا ضرورت ہے؟ اس کو یہ خطاب نہیں کہ گناہ سے مغموم نہ ہو کہ توبہ اس کا علاج ہے۔ بس میرا مقصود گناہ کی اجازت دینا نہیں۔ نیز ظاہر ہے کہ جس سے گناہ بالکل نہ ہو اور جس سے گناہ ہوا کرے لیکن توبہ بھی کرلے ان میں بڑا فرق ہے۔

شبہ کا جواب

اگر کوئی طالب علم شبہ کرے کہ حدیث میں تو آیا ہے ''اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَہٗ'' (گناہ سے توبہ کرنے والا مثل اس شخص کے ہے جس نے گناہ کیا ہی نہیں) جس سے مماثلت (۱) معلوم ہوتی ہے۔ جواب یہ ہے کہ خود اس حدیث سے ہی فرق معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ مشبہ بہ وجہ شبہ میں مشبہ سے زیادہ ہوتا ہے پس ''مَنْ لَّا ذَنْبَ لَہٗ'' (جس نے گناہ نہیں کیا) ''تَائِبٌ مِنَ الذَّنْبَ'' (گناہ سے توبہ کرنے والا) میں فرق ہے۔

ایک جولاہے نے اس کی مثال بیان کی تھی جب کسی طالب علم نے یہ حدیث اس کے سامنے بیان کی کہنے لگا کہ بننے میں جب تاگا ٹوٹ جاتا ہے جوڑنے سے جڑ تو جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی گرہ رہ جاتی ہے صفائی نہیں آتی۔

---

(۱) دونوں میں برابری معلوم ہوتی ہے۔

اہل اللہ کی صحبت کا اہتمام

بہر حال توبہ ہر وقت لازم ہے اور اس توبہ کا مکمِّل (۱) یہ بھی ہے کہ حقوق العباد کو ادا کریں دوسرے اعمال صالحہ کو اختیار کریں تا کہ مغفرت کے ساتھ اجر کبیر بھی مرتب ہو اور اعمال صالحہ کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک تو ہمت دوسرے علم بلکہ علم کی ضرورت تو توبہ میں بھی ہے اور علم کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ مولوی بنو بلکہ اردو کے رسائل سبقاً سبقاً کسی عالم سے پڑھ لو یا سن لو بس یہ بھی کافی ہے اور ہمت بڑھانے کے ئے اہل بیت یعنی اہل اللہ کی صحبت اختیار کرو کہ یہ عجیب خاصیت رکھتی ہے۔

اللہ تعالیٰ زندہ ہیں اور ہر چیز پر قادر ہیں

آگے ارشاد ہے: ﴿وَاَسِرُّوا قَوْلَكُمْ اَوِاجْهَرُوْا بِهٖ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ (۲) ”تم اپنی بات کو آہستہ سرگوشی سے کہو یا جہر سے بیشک اللہ تعالیٰ دلی بات سے واقفیت رکھتے ہیں“۔ یہ مضامین تاکید خشیت کے لئے بڑھائے گئے ہیں تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ دنیا میں قیاس (اَلْقِيَاسُ الْغَائِبُ عَلَى الشَّاهِدِ) کا مادہ فاسدہ بہت پھیلا ہوا ہے یعنی غائب کو حاضر پر قیاس کرتے ہیں خدا تعالیٰ کو اپنے اوپر قیاس کرتے ہیں چنانچہ ایک بڑھیا نے خود مجھ سے پوچھا مولوی جی تمہیں اللہ میاں کے یہاں کی سب خبر ہے۔ یہ تو بتلاؤ کہ اللہ میاں زندہ بھی ہیں۔ وہ بیوقوف تو یہ سمجھی کہ مدت ہوگئی ہے اب تک کیا زندہ ہوتے اپنے اوپر قیاس کیا کہ جس طرح ہم مرور زماں (۳) سے فنا ہو جاتے ہیں ”نَعُوْذُ بِاللّٰهِ“۔ اللہ تعالیٰ بھی

---

(۱) اس توبہ کی تکمیل کرنے والی چیز یہ ہے (۲) سورۃ الملک: ۱۳ (۳) زمانے کے گذرنے سے ہلاک ہوجاتے ہیں

ابتک کیا زندہ ہوں گے۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ اس کو دلیل سے سمجھانا چاہئیے۔ میں نے پوچھا بڑی بی تم بتلاؤ۔ رزق کون دیتا ہے؟ کہا کہ اللہ میاں، بارش کون برساتا ہے؟ کہا کہ اللہ میاں، اولاد کون دیتا ہے؟ کہا کہ اللہ میاں، میں نے کہا کہ پھر یہ کام زندہ کیا کرتا ہے یا مردہ، کہنے لگی کہ مردہ سے کیا ہوتا ہے میں نے کہا بس تو سمجھ لو کہ جب اللہ میاں یہ سب کام کرتے ہیں تو وہ زندہ ہیں کہنے لگی کہ ہاں بیشک زندہ ہیں۔

ایک اور بڑھیا اپنی حالت کی شکایت مجھ سے کرنے لگی کہ تنگی ہے، افلاس ہے، یہ ہے، وہ ہے اور آخر میں کہنے لگی میں زیادہ نہیں کہتی کبھی اللہ میاں یوں نہ کہیں کہ میرے عیب کھولتی پھرے ہے۔ ''نَعُوْذُ بِاللّٰہِ'' لیکن ایسے بھولے بھالوں سے مواخذہ بھی نہیں ہے۔ یہ تو کم عقلوں کی حکایتیں ہیں وہ تو اس مرض میں مبتلا ہیں ہی۔

اللہ کا علم محیط ہے

لیکن ''قیاس الغائب علی الشاهد'' (۱) ایسا مرض ہے کہ اس میں بڑے بڑے عقلاء مبتلا ہیں اور یہ بڑی گمراہی کا باعث ہوا ہے اس لئے خشیت کی فضیلت معلوم کرنے کے بعد ممکن ہے کہ کسی کو خیال ہو کہ میاں ہم ایسی جگہ جا کر گناہ کریں گے کہ کسی چیز کو خبر ہی نہ ہو اس کے جواب میں ارشاد ہے کہ تم لوگ خواہ سرگوشی کرو یا جہر (۲) سے بات کرو ہم کو دلوں تک کی خبر ہے۔ سبحان اللہ! کیا کلام ہے؟ ﴿اِنَّہٗ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ ''وہ دلی باتوں سے واقف ہیں'' میں قول سے لے کر ذات الصدور تک جتنے مراتب ہیں ظہور واخفا کے سب آ گئے۔ (۳)

---

(۱) غائب کو حاضر پر قیاس کرنا (۲) آہستہ بات کرو یا زور سے (۳) زبان سے لیکر دل تک کے جتنے مرتبے ظاہر اور پوشیدہ کلام کے ہیں سب آ گئے۔

آگے اس کے دلیل عقلی ہے ﴿اَلَا یَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ﴾ ’’وہ ذات جس نے پیدا کیا ہے وہ نہ جانے گا‘‘۔ یہ عقلی مسئلہ ہے کہ ایجاد بعد علم کے ہوتا ہے اس لئے کہ فعل اختیاری مسبوق بالارادہ ہوتا ہے اور ارادہ مسبوق بالعلم سے مطلب یہ ہوا کہ کیا ہم تمہاری چھپی کھلی ہوئی بات سے ناواقف ہیں ہم نے خود ہی تو سب کو پیدا کیا ہے۔ اس میں بڑی تاکید خشیت کی ہوگئی کہ ہر حال میں ڈرنا چاہئے۔ آگے ارشاد ہے: ﴿وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾ ’’وہ باریک بیں اور پورے باخبر ہیں‘‘ یہ جملہ بھی خشیت کا مؤکد(۱) ہے اس لئے کہ نہ ڈرنے کی دو وجہ ہوتی ہیں کبھی تو مخوف منہ کا بعید ہونا(۲) تو اس کی نسبت تو ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت قریب ہیں لیکن چونکہ لطیف ہیں اس لئے نظر نہیں آتے۔ دوسری وجہ نہ ڈرنے کی مخوف منہ کو خبر نہ ہونا ہوتی ہے(۳)۔ تو اس لئے فرماتے ہیں کہ وہ خبیر بھی ہیں غرض ’’بفحواءِ قیاس الغائب علی الشاھد‘‘(۴) تم ہم کو مخلوق پر قیاس نہ کرو ہم سے تم کسی بات کو چھپا نہیں سکتے۔ اس لئے خشیت ضروری ہے۔ ان آیات سے خوف کی فضیلت اور اس کا مفتاح سعادتِ دنیویہ واخرویہ ہونا معلوم ہوگیا اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ خشیت بہت ہی ضروری شے ہے۔

طریقہ تحصیلِ خشیت

اب یہ بات رہی کہ بیشک ضروری تو ہے لیکن اس کا طریقۂ تحصیل کیا ہے؟ اس لئے میں مختصر طور پر ایک دستور العمل عرض کرتا ہوں کہ جس پر عمل کرنے سے خشیت پیدا ہوگی وہ یہ ہے کہ اپنے روزانہ اوقات میں سے آدھ گھنٹہ یا بیس

---

(۱) اس جملہ سے بھی خوف خدا پیدا ہونے کی تاکید ہوتی ہے (۲) جس سے ڈرایا جارہا ہے وہ دور ہے (۳) جس سے ڈرایا جارہا ہے اس کو خبر نہ ہو (۴) غائب کو حاضر پر قیاس کے طریقے پر ہمیں مخلوق پر قیاس نہ کرو۔

منٹ نکال کر تنہا بیٹھ کر دو چیزوں کو سوچا کرو۔ اول تو اپنے اعمال سیئہ (۱) یاد کرو اور خدا تعالیٰ نے جو اس پر سزا مقرر فرمائی ہے اس کو سوچا کرو اور اس کے بعد اپنے نفس سے کہو کہ اے نفس تو کیوں ہلاک ہوتا ہے دیکھ تو سہی ان اعمال کی یہ پاداش (۲) تجھ کو بھگتنا پڑیگی اور اس کے بعد اپنے مرنے سے لے کر جنت اور جہنم کے داخل ہونے تک جو جو واقعات پیش آنے والے ہیں مثلاً قبر میں جانا' منکر نکیر کا سوال کرنا' حساب کتاب' صراط (۳) سب واقعات تفصیل کے ساتھ سوچو یہ وظیفہ اپنا روزانہ رکھو۔ دیکھئے تو سہی کیا ثمرہ ہوتا ہے مگر مشکل تو یہ ہے کہ ہم لوگ کچھ کرتے ہی نہیں بس یہ چاہتے ہیں کہ کوئی ایسی نظر ڈال دے یا دعا کر دے یا تعویذ دیدے کہ آپ سے سب گناہ بھی چھوٹ جائیں اور عمل بھی خود بخود ہونے لگیں ہم کو کچھ کرنا نہ پڑے جو کچھ کرے دوسرا ہی کرے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بمبئی میں کسی نے حج کے لئے دعا کرائی تھی فرمایا میں تو تمام عمر دعا کروں اور تم تجارت کرتے رہو حج کیسے نصیب ہوگا۔ اس شرط سے دعا کرتا ہوں کہ جس روز جہاز جانے لگے مجھ کو اپنے اوپر کامل اختیار دیدو میں ہاتھ پکڑ کر جہاز پر سوار کرادوں گا پس حج کرلو گے۔

دعا اور تدبیر

غرض دعا بھی کراؤ اور خود بھی سعی کرو۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب ہم نے کوشش کی تو دعا ہی کا کیا اثر ہوا؟ بات یہ ہے کہ دو قسم کی چیزیں ہیں ایک وہ جو بالکل ہمارے اختیار میں نہیں اور مطلوب من العباد (۴) نہیں ہیں اور دوسری وہ کہ

---

(۱) برے اعمال (۲) سزا (۳) پل صراط سے گذرنا (۴) عبادت میں مطلوب بھی نہیں۔

ان کے اسباب اختیاری ہیں پہلی قسم میں تو محض دعا پر اکتفا کرنا چاہیئے جیسے کوئی آفتِ سماوی(۱) ہے اس کے لئے دعا کرنا کافی ہے اور جن کے اسباب اختیار میں ہیں ان کے اندر تدبیر کرو لیکن چونکہ تدبیر کا مؤثر ہونا اختیار سے خارج ہے اس لئے اس کے لئے دعا کرو اور دعا سے اس تدبیر میں برکت ہوجائے گی حاصل یہ ہے کہ اس دستور العمل پر روزانہ بلا ناغہ عمل کرو۔ اور دعا بھی کرو کہ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔ آمین ۔(۲)

تمت

---

(۱) ناگہانی مصیبت (۲) اللہ تعالیٰ ہم سب کو توبہ کرنے اور عمل کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

خلیل احمد تھانوی ۲۷ مئی ۲۰۰۷ء

خواصُ الخَشِيَّة

(خوفِ حق کے خواص و آثار)

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱	خطبۂ ماثورہ	۳
۲	مفتاح الاعمال	۳
۳	اعمال کی اقسام	۴
۴	وجوہِ خوف	۵
۵	خوف کے فوائد	۵
۶	مراتبِ خوف و ایمان	۶
۷	ایمان کی تازگی	۷
۸	اشکال کا جواب	۸
۹	خوفِ اعتقادی اور خوفِ حالی	۸
۱۰	حدیث کے معنی	۹
۱۱	خوفِ خدا نہ ہونے کی شکایت	۱۰
۱۲	خوفِ رسوائی	۱۰
۱۳	دوزخ میں کفّار کا حال	۱۲
۱۴	میدانِ حشر میں لوگوں کا حال	۱۲
۱۵	مراتبِ خوف	۱۴

۱۶	شبہ کا جواب	۱۵
۱۷	مخالفت الہام کا وبال	۱۶
۱۸	حاجی امداد اللہ صاحبؒ پر ادب کا غلبہ	۱۷
۱۹	غلاف کعبہ اور غلاف روضہ رسول کا احترام	۱۷
۲۰	انتخاب آیت کی وجہ	۱۸
۲۱	خوف کا اثر	۱۸
۲۲	حاجی صاحب کا ارشاد	۱۹
۲۳	سالکین مستہلکین	۲۰
۲۴	قبض کا علاج	۲۰
۲۵	خوف کی اقسام	۲۱
۲۶	تفسیری نکتہ	۲۲
۲۷	افراط وتفریط میں تعدیل	۲۲
۲۸	‘‘رَبَّھُمْ’’ کی قید کا فائدہ	۲۴
۲۹	ارتکاب گناہ سے رزق گھٹتا ہے	۲۴
۳۰	مال ودولت سے مقصود کیا ہے	۲۵
۳۱	حقیقی راحت وسکون ذکر اللہ میں ہے	۲۶
۳۲	بے حسی اور اس کا ادراک	۲۶
۳۳	فرمانبردار اور نافرمان کے خوف کا فرق	۲۷
۳۴	اطاعت کا خاصہ	۲۸

۳۵	اہل اللہ کا حال	۲۹
۳۶	گناہگاروں کا حال	۲۹
۳۷	اطاعت خداوندی میں راحت ہے	۳۰
۳۸	اطاعت گذار اور نافرمان کی حالت میں فرق	۳۱
۳۹	مفتی عنایت احمد صاحب کیفیتِ اطمینان	۳۱
۴۰	کھانے کی اصل لذت مطیع کو حاصل ہے	۳۲
۴۱	خشیت اور مغفرت اور اجر کبیر میں جوڑ	۳۳
۴۲	تفسیری نکتہ	۳۴
۴۳	علم کی کمی کا نقصان	۳۴
۴۴	توبہ کی ہر وقت ضرورت ہے	۳۵
۴۵	توبہ نہ کرنے کا بہانہ	۳۶
۴۶	بار بار توبہ کرنے کا فائدہ	۳۷
۴۷	مضمون کا مخاطب کون؟	۳۷
۴۸	شبہ کا جواب	۳۸
۴۹	اہل اللہ کی صحبت کا اہتمام	۳۹
۵۰	اللہ تعالیٰ زندہ ہیں اور ہر چیز پر قادر ہیں	۳۹
۵۱	اللہ کا علم محیط ہے	۴۰
۵۲	طریقہ تحصیل خشیت	۴۱
۵۳	دعا اور تدبیر	۴۲

نعت

پڑگئی جس پر نظر وہ دُرِّ یکتا بن گیا
جو مریض آیا تیرے در پر مسیحا بن گیا

ہاتھ رکھا تو نے جس پتھر پہ ہیرا بن گیا
مل گیا آکر جو پارس سے وہ سونا بن گیا

جگمگایا سارا عالم چودھویں کے چاند سے
آگیا بزم قمر میں جو ستارہ بن گیا

تیری شفقت سے ہوا ہادی ہر اک گم کردہ راہ
اس کو منزل مل گئی ناصح جو تیرا بن گیا

جو مئے رشد و ہدایت تو نے میخواروں کو دی
قطرہ قطرہ اس کا جام دردِ صہبا بن گیا

آنسوؤں کو اپنے دامن میں سمویا رات بھر
صبح جب دامن نچوڑا ہم نے دریا بن گیا

اک نظر نے ان کی اے عارفؔ کہاں پہنچا دیا
دیکھ ظالم کیا تھا پہلے تو اور اب کیا بن گیا

مشرف علی عارف تھانوی

23-05-07